محرم الحرام اور واقعہ کربلا

مزاج صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں

حافظ محمد ابراہیم مجددی نقشبندی مدظلہ

خلیفہ مجاز

حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ

پسند فرمودہ

حضرت مولانا حافظ فضل الرحیم دامت برکاتہم العالیہ

مہتمم، جامعہ اشرفیہ لاہور

الکہف پبلیکیشنز

AL-KAHAF PUBLICATIONS

محرم الحرام اور واقعہ کربلا

مزاج صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں

حافظ محمد ابراہیم مجددی نقشبندی مدظلہ

خلیفۂ مجاز

حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ

الکہف پبلیکیشنز

AL-KAHAF PUBLICATIONS

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	....	محرم الحرام اور واقعہ کربلا مزاج صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں
مؤلف	....	حافظ محمد ابراہیم مجددی نقشبندی
ترتیب و تصحیح	....	مولانا عبد الرحمن عارف (فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور) مولانا محمد عمار (فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی)
مرتب	....	مولانا قاری محمد عمران خان صاحب (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)(فاضل جامعہ مدینہ کریم پارک لاہور)
کمپوزنگ	....	حافظ عبد الوحید اعوان (فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور)
اشاعت اول	....	اگست 2019
تعداد	....	2200

ملنے کا پتہ

مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ، فیصل آباد
+92-41-2649680,03009652292

الکہف پبلیکیشنز
AL-KAHAF PUBLICATIONS

بسم الله الرحمن الرحيم

(پہلا حصہ)

محرّم الحرام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ كَفٰى وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَا دِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى. أَمَّا بَعْدُ:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ط﴾ (سورۃ التوبۃ: الآیۃ 36)

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

خلاصۂ بیان

آج 29 ذوالحجہ ہے 1437 ہجری سال ہے۔ اُمید ہے کہ اگر چاند نظر آ گیا تو کل سے اِن شاء اللہ نیا سال شروع ہو جائے گا، اور نہیں تو پرسوں سے شروع ہوگا۔ آج جو بات کرنی ہے وہ محرّم الحرام کے حوالے سے ہے۔ اس میں تین باتیں ہیں:

پہلی بات: تقویمِ ہجری یعنی ہجری کیلنڈر کیا ہے؟ ہم عیسوی سال بھی دیکھتے ہیں یعنی جنوری، فروری، مارچ وغیرہ۔ اسلامی سال بھی دیکھتے ہیں جو محرّم سے شروع ہوتا ہے، پھر صفرالمظفّر، پھر ربیع الاوّل وغیرہ۔

دوسری بات: محرّم الحرام کے مہینے کی اللہ کے یہاں کیا حرمت اور عزّت ہے؟

تیسری بات: دسویں محرّم کے دن کی کیا فضیلت ہے اور کب سے ہے؟

ان سب کی وضاحت پیش کی جائے گی اِن شاء اللہ۔

محاسبہ نفس

لیکن ان سب باتوں کے بیان سے پہلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس سال یعنی چودہ سو سینتیس کے ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ ہم یہ سوچیں کہ کیا اس سال میں ہم اپنے اللہ کو راضی کر پائے ہیں؟ ایک سال ہماری زندگی کا اور ختم ہونے والا ہے تو کیا اس میں ہم نے اللہ کو راضی کرلیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو توبہ کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی فکر کریں کہ ہماری زندگی سے ایک سال اور ختم ہوگیا اور ہم اپنی موت کے اور قریب ہوگئے۔ اب نیا سال شروع ہونے والا ہے تو اس میں ہم نیت اور ارادہ کریں کہ اے اللہ! اس آنے والے سال کو ہم پہلے سے بہتر گزاریں گے۔ اعمال کے حساب سے بھی، اَخلاق کے حساب سے بھی ہم پہلے سے بہتر گزاریں گے۔

نیکیوں کے لیے ٹارگٹ بنائیں

ہم دنیا کے اندر اپنے کچھ اچھے اچھے ٹارگٹ بنائیں۔ جیسے Companies جب کاروبار کرتی ہیں تو ہر سال ختم ہونے پر بتاتی ہیں کہ اس سال ان کی کارکردگی کیا رہی۔ اور اگلے سال کا جو ٹارگٹ وہ دیتی ہیں، وہ پہلے سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہم بھی اپنے اگلے سال کے لیے نیکیوں کے ٹارگٹ پہلے سے زیادہ بنائیں۔ اب دنیا کا وقت اور کم ہو گیا ہے۔ جو وقت ہم لے کر آئے تھے وہ اور کم ہوتا چلا جارہا ہے۔ روز ایک دن کم ہو رہا ہے، لہٰذا اور زیادہ فکر کی ضرورت ہے۔ جیسے کرکٹ کے اندر Runs زیادہ باقی ہوں اور Over کم رہ جائیں تو انسان کو ذرا محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ ہماری زندگی کے Over میں بھی یہ ایک Over اور کم ہو گیا۔ سال کو Over گن لیں۔ آج کل کے نوجوانوں کو یہ ہی Language سمجھ آتی ہے، تو سمجھ لیں کہ ایک Over اور گزر گیا۔ اور یہاں تو ایک ہی Chance ملتا ہے، دوبارہ والا معاملہ نہیں ہے۔ ہم غور کریں کہ ابھی تک ہم نے اللہ کو راضی کر لیا ہے کہ نہیں، ہمارے دلوں میں سکون آیا ہے کہ نہیں۔ اگر نہیں آیا تو پھر محنت کی ضرورت ہے، بہت محنت کی ضرورت ہے۔

بھیڑ لگانا مقصد نہیں

دیکھیے! اس مجلس میں بھیڑ لگانا مقصد نہیں ہے الحمدللہ! ہمارے یہاں ایسے کئی لوگ ہیں جو بھیڑ لگا لیتے ہیں۔ بھیڑ تو مداری بھی لگا لیتے ہیں۔ بازاروں میں بھیڑ لگانی ہو تو ایسے حربے بندہ استعمال کر سکتا ہے کہ بھیڑ لگ جائے، لیکن یہاں آنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے اندر دین کو لے آئیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو لے آئیں۔ ایسے چند لوگ بھی تیار ہو گئے تو ان شاء اللہ موت کا سفر آسان ہو جائے گا۔ ہم اس طرح پورے سال

کا اپنا احتساب خود کریں۔ اللہ تعالیٰ نے تو پوچھنا ہے کہ 1437 کا سال کیسے گزارا؟ ایک ایک دن کا سوال ہوگا ہم ابھی سے اس کا اہتمام کریں۔ ایک بات تو یہ تھی۔

تقویم، کیلنڈر اور جنتری

اِسلامی نقطہ نظر سے محرّم الحرام کا مہینہ، یہ قمری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ محرّم کے مہینے سے اسلامی سال کا آغاز ہوتا ہے۔ اور دینِ اسلام کے جتنے بھی احکامات ہیں وہ اکثر و بیشتر قمری تاریخ کے حساب سے ہی چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہم بات کرتے ہیں نظامِ تاریخ کی، جسے ہم کیلنڈر کہتے ہیں۔ یہ کیلنڈر کیا ہے؟ سال کے دنوں، ہفتوں اور مہینوں کو صحیح اندازے اور صحیح مقدار کے ساتھ تقسیم کرنے کو اُردو بول چال میں نظامُ الاوقات کہتے ہیں۔ اسے عربی میں تقویم، انگریزی میں کیلنڈر، اور ہندی میں جنتری کہا جاتا ہے۔ اس تقویم کے ذریعے سے دن اور وقت کو معلوم کرنے کا نام تاریخ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وقت معلوم کرنا یہ تاریخ ہے۔ اور تاریخ کا ذریعہ یہ کیلنڈر یا تقویم یا نظامُ الاوقات ہے۔ ماضی کے معاملات یاد رکھنے ہوں یا مستقبل کی کوئی تاریخیں طے کرنی ہوں، شادی بیاہ کی تاریخ طے کرنی ہے، یا سفر کی تاریخ طے کرنی ہے تو انسان کو تاریخی نظام کی شدید ترین ضرورت ہے، اس کے بغیر یہ سارے معاملات ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ ضرورت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی مستقل تاریخی نظام ہو۔

تین طرح کے نظام

چناں چہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دنیا کے اندر کئی تاریخی نظام ابھی بھی چل رہے ہیں اور ان کا بنیادی مدار تین چیزوں پر ہے:

1 سورج 2 چاند 3 ستارے۔

شمسی سورج سے چلنے والا نظام، قمری چاند سے چلنے والا نظام، اور نجومی ستاروں سے چلنے والا نظام۔ پھر شمسی تاریخ کے اعتبار سے ہمارے یہاں عیسوی کیلنڈر رائج ہے، اسے عربی میں میلادی کہتے ہیں۔ دوسرا نظام بکرمی کلینڈر کا ہے، اس کو ہندو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے متعلق کسی خاص تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا جو ہمارے یہاں مروّج ہے اسی کی بات کر لیتے ہیں۔ تو عیسوی کلینڈر جنوری سے شروع ہو کر دسمبر میں ختم ہوتا ہے، اس میں بارہ مہینے ہیں۔

عیسوی مہینوں کی وجہ تسمیہ

انسائیکلو پیڈیا اور برڈانیکا Bardanika کے اندران بارہ مہینوں کی جو تفصیل لکھی ہے اور ان ناموں کا مطلب لکھا ہے وہ یہ ہے:

1. جنوری: یہ جانوس سے لیا گیا ہے یہ ایک دیوتا کا نام ہے۔ رومی لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ایسے چہرے والا ہے کہ آگے بھی دیکھتا ہے اور پیچھے بھی دیکھتا ہے تو نسبت دیوتا کی طرف ہو رہی ہے، غیر اللہ کی طرف ہو رہی ہے۔
2. فروری: یہ فیبروا Febrva ایک دیوی ہے جس کو وہ پاکیزہ اور مقدّس مانتے تھے، پاکدامن مانتے تھے، اور مقام دیتے تھے۔
3. مارچ: یہ مارس Mars سے لیا گیا ہے جو رومیوں کے نزدیک جنگ کا دیوتا تھا۔
4. اَپریل: یہ ابریری Abrery سے لیا گیا ہے، اس کے معنی پھولنے کے ہیں، کِھلنے کے ہیں کہ بہار کا موسم ہوتا ہے اور پھول کِھلتے ہیں۔
5. مئی: یہ میا Maia یا میّا Mayya سے لیا گیا ہے جو افسانوی شیطان ایٹلس کی بیٹیوں میں سے ایک کا نام ہے۔

6 جون: یہ یینون سے لیا گیا ہے جو دیویوں کے سردار جُپیٹر Jupiter کی بیوی تھی۔

7 جولائی: کیلنڈر کے بانی جولیس قیصر Julius Ceaser کی یادگار کے طور پراس مہینے کا نام جولائی رکھ دیا گیا۔

8 اگست: یہ آٹھواں مہینہ کہلاتا ہے۔ رومیوں کے بادشاہ جولیس قیصر Julius Ceaser کے جانشین Augustus کی یادگار کی بنیاد کے اوپر اس کا نام اس کی نسبت سے رکھ دیا گیا۔

9 ستمبر: لاطینی زبان کے مطابق اس کا ترجمہ بنتا ہے ساتواں مہینہ۔ قبلِ مسیح لوگ مارچ سے سال شروع کرتے تھے تو اُن کے حساب سے یہ ساتواں مہینہ بنتا تھا، بعد میں تبدیلی آگئی اور جنوری سے سال شروع کرنے لگ گئے۔ تو ستمبر کا مطلب ہے ساتواں مہینہ۔

10 اکتوبر کا مطلب ہے آٹھواں مہینہ۔

11 نومبر کا مطلب ہے نواں مہینہ۔

12 دسمبر کا مطلب ہے دسواں مہینہ۔

یہ بارہ نام ہیں جو انگریزی مہینوں کے رکھے گئے۔ ان سب کی نسبت آپ دیکھیں کہ دین کی نسبت سے نہیں، اللہ کی نسبت سے نہیں، غیر اللہ کی نسبت سے یہ نام ہیں۔

قمری مہینوں کے نام

تیسرا انظام قمری سال کے اعتبار سے ہے جس کا تعلق چاند کے گھٹنے بڑھنے سے ہے۔ اس کے نام کونسے ہیں؟ یہ نام ہر مسلمان کو یاد ہونے چاہیے۔ محرّم الحرام سے یہ سال شروع ہوتا ہے:

1 محرّم 2 صفر 3 ربیع الاول 4 ربیع الثانی 5 جُمادَی الاولیٰ
6 جُمادَی الاُخریٰ 7 رجب 8 شعبان 9 رمضان 10 شوّال
11 ذی قعدہ 12 ذی الحجہ۔

یہ بارہ مہینے ہیں۔ اور ان بارہ مہینوں کے نام یاد رکھنا اچھی بات ہے۔ اسلامی اور قمری سال تو محرّم الحرام سے شروع ہوتا ہے، اس کی تفصیل ابھی ذکر ہوگی اِن شاءاللہ۔

بکرمی تقویم

رہی بات بکرمی سال کی ابتدا کی تو اس کی نسبت راجہ بکرم اجیت کی طرف کی جاتی ہے جب اس کی تاج پوشی ہوئی تھی، وہیں سے یہ سال شروع ہوا۔ اسے دیسی سال یا جنتری بھی کہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت

اور مسلمان اسلامی سال کو ہجرت سے منسوب کرتے ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کی نسبت سے ہجری سال نام طے ہوا۔

قمری نظام اور دیگر میں فرق

ایک سوال یہ ہے کہ قمری نظام اور دوسرے نظام میں کیا فرق ہے؟ اس سلسلے میں علماء نے مختلف باتیں لکھی ہیں۔ یہ باتیں کبھی کبھی ہوتی ہیں، ذہن میں ہونی چاہییں۔

قمری سال خالصتاً اللہ رب العزت کا بنایا ہوا نظام ہے۔ یہ فطری نظام ہے۔ انسانوں کا گھڑا ہو، بنایا ہوا نہیں ہے۔ اس میں انسانی عقل کا کوئی دخل نہیں۔ جس دن اللہ ربّ العزّت نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا، اس دن جو قانون بنایا تھا قمری اعتبار سے یہ وہ قانون ہے۔ اور اس وقت موجودہ قمری مہینے ذی الحجہ کی آج 29 ویں تاریخ

ہے جو 100 فیصد سچی اور پکی بات ہے، اس میں کوئی شک، کوئی شبہ نہیں۔ آج کل لوگ پریشان ہو جاتے ہیں کہ رؤیتِ ہلال کمیٹی کو کبھی چاند نظر آجاتا ہے اور کبھی نہیں آتا، یا یہ لوگ اپنی مرضی کرتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان کی مرضی کوئی نہیں ہے۔ یہ اللہ ربّ العزّت کا بنایا ہوا نظام ہے۔ مرضی تو لوگ اس وقت کرتے تھے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اظہارِ نبوت سے پہلے مشرکین مہینوں کو آگے پیچھے کر دیا کرتے تھے۔ محرم کا مہینہ آرہا ہے، یا حج کا مہینہ آرہا ہے تو وہ اپنی کسی ضرورت کے تحت کہتے تھے کہ اس سال محرّم بعد میں آئے گا، صفر پہلے آئے گا۔ اس وقت جو بھی معاملہ تھا، بہرحال اب کوئی ایسا معاملہ نہیں۔ اور وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

اَشہرِ حُرُم اور قتال

ایک وجہ تو یہ ہے کہ سال کے چار مہینے بڑی عزّت اور حرمت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ میں ان چار مہینوں کو اشہرِ حرم فرمایا ہے۔ ان چار مہینوں میں لڑنے کی ممانعت تھی، قتال کی ممانعت تھی، عرب لڑائی نہیں کرسکتے تھے جبکہ عربوں میں لڑنا ان کی گھٹی میں بسا ہوا تھا۔ لڑے بغیر ان کا معاملہ چلتا ہی نہیں تھا۔ ایسی ایسی باتوں پر آپس میں لڑائی ہو جاتی تھی کہ انسان حیران ہوتا ہے۔ دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں، دونوں کے الگ الگ باغ ہیں۔ دونوں ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک کے باغ سے چڑیا اُڑ کر دوسرے کے باغ میں جا کر بیٹھ گئی۔ بس اسی بات پر لڑائی ہوگئی کہ میرے باغ سے چڑیا تیرے باغ میں کیسے چلی گئی، یا تیرے باغ سے میرے باغ میں کیسے آگئی۔ اب لڑائی شروع ہوگئی۔ اسی طرح ایک لڑائی دس سال تک دو قبیلوں کے درمیان جاری رہی اور بہت ہی معمولی بات پر۔ وہ کیا بات تھی؟ ایک سردار قسم کے آدمی نے اپنی ٹانگ پھیلا دی اور کہا

کہ کوئی مجھ سے بڑا سردار ہے تو اس پر وار کر کے دکھائے؟ دوسرے نے تلوار لی اور اس کی ٹانگ کاٹ دی۔ اسی بات پر سینکڑوں افراد قتل ہو گئے۔ اللہ اکبر!

تو ان چار مہینوں میں لڑائی کی ممانعت تھی اور اس کا احترام عرب کرتے تھے۔ اب تین مہینے تو اکٹھے تھے: ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرّم، جبکہ رجب الگ تھا۔ اب جب لڑائی کے بغیر ان کے تین مہینے گزر جاتے تھے تو پریشانی ہوتی تھی کہ بھئی تیسرا مہینہ کیسے گزاریں۔ تو وہ آپس میں طے کر لیتے تھے کہ اس دفعہ محرّم کو لیٹ کر دیتے ہیں تا کہ آسانی سے لڑائی کر سکیں۔ ابھی صفر شروع ہو جائے ہم لڑ بھڑ لیں گے اور اس کے بعد دوبارہ محرّم آ جائے گا پھر بیٹھ جائیں گے۔

اعلانِ حجۃ الوداع

اور آج جیسے کہ 29 ذی الحجہ ہے تو یہ یقینی بات ہے کہ 29 ذی الحجہ ہی ہے۔ نبی کریم a نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا:

إن الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السماوات والأرض.

(صحيح البخاري: رقم 4662)

اس حدیث شریف کا خلاصہ یہ ہے کہ اب قریش کا وہ معاملہ ختم ہو گیا اور اسلامی تقویم اپنے اسی طرز پر آ گئی جب اللہ نے اس زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ اور پھر اس وقت سے لے کر آج تک اُمتِ مسلمہ اس کی محافظ ہے۔ رمضان ہمیشہ رمضان میں ہوا، عید ہمیشہ عید میں ہوئی۔ ہر چیز اپنے موقع پر ہوئی۔ اسی لیے یہ یقینی طور پر کامل نظام ہے جس کے اندر اللہ کی ترتیب باقی ہے۔ اب جو عیسوی نظام ہے اس میں ان ہی کی تاریخ کے مطابق کئی ترمیمیں ہو چکی ہیں۔ آٹھ (8) عیسوی میں ہوئی، 799 عیسوی میں ہوئی،

1477 میں ہوئی، 1582 میں ہوئی۔ کبھی ان کا مہینہ 20 دن کا ہوتا تھا، کبھی ان کا سال 14 مہینہ کا بھی ہوا، اور کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ تو مختلف ترمیبات یہ لوگ چلاتے رہے، ایسی صورت میں ان کی تاریخ کا کیا اِعتبار رہے۔

فطرتی نظام

ایک اور بات کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے جو تاریخی نظام دیا یہ بھی فطرت کے مطابق ہی دیا۔ انسان کی جو روزمرّہ کی ضروریات ہیں، اللہ ربّ العزّت نے چاند کا نظام ایسی خاص ترتیب پر بنا دیا کہ ہر انسان ہر علاقے میں چاند کو دیکھ کر تاریخ کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ شروع میں یہ مغرب کی طرف آپ کو بہت پتلا نظر آئے گا، یہ ابتدائی تاریخیں ہوں گی۔ پھر چودھویں رات کو کوئی بھی دیکھے، اَن پڑھ دیکھے، پڑھا لکھا دیکھے، چھوٹا دیکھے، بڑا دیکھے، شہر والا دیکھے یا دور دراز کسی علاقوں میں یا پہاڑوں میں، جنگلوں میں رہنے والا دیکھے، اس کو چودھویں رات کا چاند چودھویں ہی کا نظر آئے گا تو تاریخ کا اندازہ ہو جائے گا۔ پھر وہ گھٹنا شروع ہو گا اپنی ترتیب کے مطابق تو معلوم ہو جائے گا۔ پھر وہ غائب ہو جائے گا تو بھی معلوم ہو جائے گا۔ اب پھر نیا مہینہ شروع ہونا ہے تو اسی طرح یہ نظام چلتا رہتا ہے۔ بغیر کیلنڈر کے، بغیر کسی چیز کے دنیا کا ہر شخص اس تاریخ کا اندازہ کر سکتا ہے یہ فطرت ہے۔ فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا ہے۔

دوسری طرف عیسوی سال کو اگر ہم دیکھیں تو آپ اس کا اندازہ بغیر پوچھے، بغیر کیلنڈر دیکھے نہیں لگا سکتے۔ ایک آدمی جنگلوں میں ہے، سمندر میں جا رہا ہے اور راستہ بھول گیا تو اس کے پاس تاریخ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جیسے Navy والے تو آج تک چاند کی تاریخ کا حساب رکھتے ہیں اور قیامت تک رکھتے رہیں گے اس کے

بغیر ان کا کام نہیں ہوگا۔تو یہ قمری نظام ایسا ہے جو عین فطرت کے مطابق ہے۔جنگل میں رہنے والا جس کو کوئی میڈیا نہیں پہنچا، اس کے پاس ذرائع ابلاغ کا کوئی ذریعہ نہیں، وہ بھی اندازہ کرسکتا ہے کہ مہینہ ختم ہورہا ہے، یا مہینہ درمیان میں ہے۔

قمری تاریخ پر حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کا عمل

قمری نظام پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی رائج رہا۔انبیاء علیہم السلام کا نظام اس کے مطابق رہا۔ چناں چہ باقی کسی بھی نظام کے بارے میں کوئی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا کہ کسی نبی نے اس کو اختیار کیا ہو۔

رات دن کا نظام

قمری مہینہ چاند کے نکلتے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ رات پہلے آتی ہے اور دن بعد میں آتا ہے۔ جیسے رمضان کے لیے چاند کا جب اعلان ہوجاتا ہے،تو ہم فوری طور پر عشاء کی نماز کے بعد تراویح شروع کردیتے ہیں، اور دن میں روزہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح عید کی رات چاندرات کہلاتی ہے۔ یہاں یہ ترتیب ہے کہ رات پہلے ہے، دن بعد میں ہے۔اور جیسے شبِ جمعہ۔ جمعہ کی جو برکتیں ہیں وہ جمعرات کے دن غروبِ آفتاب کے بعد شروع ہوجاتی ہیں۔سورۃُ الکہف آپ نے پڑھنی ہے اس وقت پڑھ سکتے ہیں۔

شرک و بدعت سے پاک

پھر قمری مہینوں کے جو نام ہیں یہ اللہ ربّ العزّت نے رکھے ہیں۔ مہینے تو سارے ہی اللہ کے ہیں، لیکن ان چار مہینوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بہت ہی قوی ہے۔قمری مہینوں کے ناموں میں کسی کو شریک، یا رسم ورواج، یا بدعت کا تصور بھی نہیں۔ اسلامی سن کا آغاز کس واقعہ سے ہورہا ہے؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہجرت سے ہورہا ہے۔اس

کے برخلاف جو باقی مہینے ہیں عیسوی مہینے، بکرمی مہینے اور بھی جو ہیں اُن کی نسبت کسی بادشاہ کی طرف ہوگی، یا کسی دیوتا کی طرف ہوگی، کسی دیوی کی طرف ہوگی، یا شیطان سے تعلق ہوگا۔لیکن قمری نسبتیں جو بھی ہیں اس میں شرک، بدعت، رسوم ورواج، غیر اللہ کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔صاف ستھرے ہیں، پاکیزہ ہیں اور منوّر ہیں۔

عبودیت کا اِظہار

اسی طرح قمری نظام کے اندر اللہ ربّ العزّت نے جو رمضان، عید الفطر اور حج اور عید الاضحیٰ کا معاملہ رکھا ہے، یہ بڑا پیارا معاملہ ہے، اور بہت ہی مزیدار ہے۔ اگر یہ سورج کے حساب سے ہوتا تو یکسانیت ہوتی کہ ہر دفعہ دسمبر میں ہی روزہ رکھنا ہے۔اب ساری زندگی دسمبر میں ہی رمضان ہوتا، ایک ہی Attraction ہی ختم ہوجاتی۔ پھر کہیں دسمبر میں 12 گھنٹے کا دن ہے تو گرمی ہے، اور کہیں دن چھوٹا ہے تو سردی ہے۔ پوری دنیا کے اندر مختلف ہے۔اب افریقہ کے اندر دسمبر میں گرمی ہوتی ہے اور جون، جولائی میں سردی ہوتی ہے۔ اللہ ربّ العزّت نے قمری نظام رکھا کہ ہر سال 10 دن نیچے آرہا ہے،تو کبھی رمضان المبارک کا مہینہ دسمبر میں آئے گا اور کبھی جون میں آئے گا۔ Change ہوتا رہے گا۔ ہر ملک کے بندے کو گرمی میں بھی عبادت کرنی ہوگی، سردی میں بھی عبادت کرنی ہوگی۔اس میں عبودیت کا اظہار بھی زیادہ ہوگا کہ اللہ! اگر گرمی میں رمضان آیا تو میں روزہ رکھنے کے لیے تیار ہوں، سردی میں آیا تو بھی میں روزہ رکھنے کے لیے تیار ہوں۔چھوٹا روزہ ہے تو تیار، بڑا دن ہے تو بھی تیار۔

چاند کا انتظار

ہر موسم میں بندے کو عادی بنایا جارہا ہے،Training دی جارہی ہے کہ دیکھو! تم

نے ہماری مان کے چلنا ہے۔ تمہیں ان نظاموں سے کیا لینا دینا! تمہیں تو ہماری بات کو ماننا ہے۔ تو یہ اس کے اندر کچھ مزے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ جو قمری نظام سے اسلامی تہوار آتے ہیں تو مسلمانوں کے دلوں میں ایک انتظار کی کیفیت ہوتی ہے اس کی لذّت کچھ اور ہوتی ہے۔ اب عیسائی لوگ جو پچیس دسمبر کو ایسٹر Eester مناتے ہیں، تو اِنتظار کی وہ کیفیت اور شدّت ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ جائیں کسی سے پوچھ لیجیے گا۔ اور اپنے دلوں سے اس کا سوال خود ہی لے لیں، بچوں سے پوچھ لیں۔ آج 27 دن گزر گئے، آج 28 دن گزر گئے، چاند کب دیکھنا ہے؟ بھئی! چاند تو 29 کو دیکھیں گے۔ اب رؤیتِ ہلال کمیٹی بیٹھی ہوئی ہے اور انتظار ہو رہا ہے کہ کیا اعلان ہوتا ہے؟ وہاں سے اعلان ہو جائے کہ عید ہے تو ایک دم دلوں کے اندر خوشی آجاتی ہے، اور اگر یہ اعلان ہو کہ چاند دکھائی نہیں دیا یا چاند نہیں نکلا اور اب کل کا روزہ رکھنا ہے تو ہم دل کی خوشی سے روزہ رکھنے کے لیے بھی تیار ہوتے ہیں۔ لیکن ایک عجیب سی خوشی اور تعلق جڑا رہتا ہے وہ یکسانیت نہیں ہوتی۔ یکسانیت سے انسان بیزار ہو جاتا ہے۔ تو اللہ ربّ العزّت نے مسلمانوں کو قمری نظام کے اعتبار سے ایسی چیز دی ہوئی ہے کہ جو خوشی والی کیفیت اس میں ہے، یہ کسی اور نظام میں ہو ہی نہیں سکتی۔

زکوٰۃ کی ادائیگی قمری اعتبار سے کیجیے

پھر قمری نظامِ تاریخ پر اِسلام کے اکثر احکامات کا مدار ہے۔ رمضان مبارک کی ابتدا اور انتہا، عید الفطر، عید الاضحیٰ، ایامِ تشریق اور زکوٰۃ کا وجوب وغیرہ۔ ہم میں سے اکثر لوگ حساب کرتے ہیں 30 جون کو اور بعض کرتے ہیں دسمبر کو، عیسوی تاریخ سے زکوٰۃ کا حساب جوڑنا یہ ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ عیسوی سال میں 365 دن ہوتے ہیں، اور قمری

اعتبار سے تقریباً 355 دن ہوتے ہیں۔ دونوں میں دس دن کا فرق آجاتا ہے۔ اور مستحقِ زکوٰۃ کا فائدہ اس میں ہے کہ اسے جلد اس کا حق مل جائے تاکہ وہ اپنی ضرورت پوری کر سکے۔ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح وہ عورت جس کا شوہر انتقال کر چکا ہو، اس کی عدّت کا معاملہ بھی قمری اعتبار سے ہے۔ بچے کا بالغ ہونا، قربانی کے جانور کی مدّت یہ سارا کچھ قمری نظام سے اللہ ربّ العزّت نے جوڑا ہے۔

کچھ تاریخی واقعات سے سال کی ابتدا

ہجری سن کی ابتدا کیسے ہوئی؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت الی المدینہ سے قمری سال کی ابتدا کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے زمانے میں مشہور واقعات سے تاریخ یاد رکھی جاتی تھی۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے قبل عام الفیل کا واقعہ پیش آیا۔ تو یوں کہا جانے لگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سال میں پیدا ہوئے جس میں ابرہہ بادشاہ ہاتھیوں کی فوج لے کعبہ پر چڑھائی کے لیے آیا تھا اور اسے عبرتناک شکست ہوئی تھی۔ یعنی بڑے بڑے واقعات کو مخصوص کر لیا جاتا، کوئی مستقل نظام نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام جب دنیا میں تشریف لائے تو سب سے پہلے اُن کے اُترنے کے سال کو مقرر کیا گیا، پھر طوفانِ نوح کے واقعے کو بطورِ سن مقرر کیا گیا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والوں نے ان کے آگ میں ڈالنے والے دن کو مقرر کیا کہ مثلاً ان کے آگ میں ڈالنے کے پانچ سال بعد میرا بیٹا پیدا ہوا، یا اتنے سال بعد میرا یہ کام ہوا۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کے ماننے والوں نے جب وہ مصر میں وزیر بن گئے تھے، اس بات کو سال کی ابتدا کے واسطے مقرر کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں نے جس دن فرعون غرق ہوا اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات ملی، اس واقعہ کو بنا لیا کہ اس سے ہم اپنا تعین کیا کریں گے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں نے ان کی پیدائش کو مقرر کر لیا کہ اس طرح

ہمارا نظام چلے گا۔ الغرض لوگ اس طرح سے مشہور واقعات کو اپنے مشاغل کی تاریخ یاد کرنے کا ذریعہ بنالیا کرتے اور ایسے واقعات کو سن قرار دے دیا کرتے تھے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔

عہدِ فاروقی اور ہجری سن کی ابتدا

پھر نبوّت کے دور سے یہ سلسلہ اس طرح سے چلتا رہا کہ کوئی واقعہ بعثت سے پہلے کا ہوتا تو کہا جاتا کہ قبل از بعثت، اور بعثت کے بعد کا ہوتا تو کہا جاتا کہ نبوّت کے دو سال بعد، تین سال بعد وغیرہ یہ واقعہ پیش آیا یا یہ حکم اُترا۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں تو مختصر سا معاملہ تھا۔ مدینہ طیبہ ہی کی جگہ تھی لیکن آگے جا کر معاملات پھیلتے چلے گئے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں جب اسلامی مملکت پھیلنی شروع ہوگئی اور فتوحات کا دروازہ کھلتا چلا گیا تو حساب و کتاب کے معاملات بھی بہت وسیع ہوگئے۔ اس لیے مسلمانوں کو ضرورت پیش آئی کہ اپنا کوئی علیحدہ اور مستقل نظام ہو جو غیروں سے ہٹ کر ہو اور فطرت کے مطابق ہو۔ مسلمانوں کی دینی حمیت اور غیرت کے مطابق ہو۔ بھلا مسلمان کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی غیروں کی چیز اپنے اندر لے آئے۔ یہ لاوارث قوم تو نہیں ہے۔ اللہ نے کیا کچھ نہیں دیا اس کو۔ اب جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ ہمارا اپنا کوئی تاریخی نظام ہونا چاہیے تو پھر حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر سوچ و بچار کی، اس پر مشورے ہوئے اور بالآخر انہوں نے سنِ ہجری کو منتخب کیا جو آج تک جاری ہے الحمدللہ! اور قیامت تک جاری رہے گا۔

بعض شبہات کا اِزالہ

بعض روایات سے یہ بھی پتا لگتا ہے کہ سنِ ہجری کی ابتدا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی

تھی، تاہم راجح یہ ہی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اس کی بنیاد پڑی۔ بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوجاتا ہے کہ جو کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا اور بعد والوں نے کیا وہ پھر ٹھیک نہیں ہے۔ ان کا یہ شبہ بہت غلط ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت اور خلفائے راشدین کی سنت میں بال برابر بھی فرق نہیں کیا۔ فرمایا:

أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَإِنْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ، فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنكُمْ يَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّهَا ضَلَالَةٌ، فَمَنْ أَدْرَكَ ذٰلِكَ مِنكُمْ فَعَلَيْهِ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ. (سنن الترمذي: رقم 2676)

”میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے اور سننے اور ماننے کی خواہ (تمہارا حاکم) حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ بلاشبہ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت سارے اختلافات دیکھے گا، اور تم دین میں نئی نئی باتوں کے پیدا کرنے سے بچنا کیوں کہ دین میں جو بھی نئی چیز نکالی جائے گی وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ پس تم پر ایسے وقت میں میرے اور میرے خلفائے راشدین، ہدایت یافتہ کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے“۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت اور اپنے خلفائے راشدین کی سنت (طریقے) کے بارے میں جو ہدایات جاری فرمائی ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں کیا۔ دونوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ مضبوطی سے تھامو۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ خلفائے راشدین کا عمل عین سنت ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے سے جتنے بھی معاملات آپ نے شروع فرمائے وہ بالکل حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مطابق، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہیں۔

ہجرت کو بطورِ سن منتخب کرنے کی وجہ

اب یہاں ایک بات یہ ہے کہ ہجرت کے عمل کو بطورِ سن کیوں منتخب کیا گیا؟ دیکھا جائے تو نبی کریم ﷺ کی پیدائش کو منتخب کیا جا سکتا تھا، دنیا سے پردہ فرما جانے کے دن کو منتخب کیا جا سکتا تھا، غزوۂ بدر کا موقع بہت بڑا تھا اس کو منتخب کیا جا سکتا تھا، فتحِ مکہ جو کہ اسلام کی بڑی عظیم الشان فتح تھی اس کو منتخب کیا جا سکتا تھا، حجۃ الوداع کو منتخب کیا جا سکتا تھا جو اسلام کی ظاہری شان و شوکت کا بہترین اظہار تھا، یا جس دن نبی کریم ﷺ پر قرآن مجید نازل ہوا غارِ حرا میں اس کو، یا جب قرآن مجید مکمل ہوا اس کو منتخب فرما سکتے تھے۔ تو اتنے مواقع میں سنِ ہجری کو ہی کیوں مقرر کیا گیا؟ ہجرت کا واقعہ کیا ہے کہ آپ ﷺ مکہ مکرّمہ میں رہ رہے ہیں، لوگوں نے رہنے نہیں دیا اور آپ ﷺ انتہائی پریشانی کے عالم میں اور تکلیف کے عالم میں بے سروسامانی کے حال میں خاموشی سے رات کی تاریکی میں نکل رہے ہیں۔ اس میں کون سی حکمت ہے؟ اس بارے میں چند باتیں سمجھ لیجیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ظہورِ اسلام سے لے کر نبی کریم ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے تک کی تاریخ میں دو زمانے اُصولی زمانے ہیں:

1. مکہ مکرّمہ کا زمانہ۔ نبوّت سے سرفراز ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ 13 سال مکہ مکرّمہ میں رہے۔ اس زمانے کے واقعات و حالات اور اَحکامات۔
2. مدینہ منوّرہ کا زمانہ۔ وہاں کے اَحکامات اور اَعمال۔

پہلا زمانہ نبی کریم ﷺ کی نبوّت سے شروع ہو کر ہجرت پر مکمل ہوتا ہے۔ اور اس کی ابتدا غارِ حرا سے اور تکمیل غارِ ثور پہ ہوتی ہے۔ دوسرا زمانہ ہجرت سے شروع ہوتا ہے

اور حجۃ الوداع کے موقع پر مکمل ہوتا ہے۔اس کی ابتدا مدینہ منوّرہ میں داخلے کے وقت والہانہ استقبال سے ہوئی اور اس کی تکمیل مکہ مکرّمہ کے فتح سے ہوئی۔ اب چند خصوصیات ہیں ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ہجرت کو بطورِ حسن طے فرمایا۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ مکرّمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئے تو ہجرت کی برکت سے مدینہ میں ایمان والوں کو ہر طرح کی عزّت، غلبہ، راحت، ثروت، سکون ہر چیز حاصل ہوئی۔ ایمان والوں کو ایک مضبوط قلعہ ملا۔ مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ عبادت کرنے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحبت سے فائدہ اُٹھانے اور دین سمجھنے کا موقع ملا۔ اہلِ اسلام نسبتاً چین کی زندگی گزارنے لگے اور اسلامی طرز، اسلامی خد و خال، اسلامی معاشرت، اسلامی تمدّن و تہذیب، غرض ہر حکم پر عمل کا اِظہار کھل کے ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی اقتصادی اور معاشی نظام کی اصلاح کی تدبیریں کی جانے لگیں۔ عملی طور پر تعلیم اور تعلّم کا سازگار ماحول مؤثر آیا۔ آزاد فضا میں رہ کر اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنا آسان ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اسلام کی تعلیمات دوسروں تک پہنچانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک اسلامی حکومت قائم ہوئی جس کے سربراہ جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے۔ وہ شروع تو مدینہ طیبہ سے ہوئی اور ساتھ ساتھ جب پھیلنی شروع ہوئی تو مضافات کے چند علاقے شامل ہوئے۔ پھر چلتے چلتے بحر الکاہل سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک پہنچے۔ تو ہجرت کا واقعہ ترقی کا زمانہ شروع ہونے کا واقعہ ہے۔

دینی غیرت و حمیّت

اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہمارے سامنے قمری تاریخ بھی ہے اور ہمارے سامنے

شمسی تاریخ بھی ہے۔ دونوں نظام اللہ کے ہیں۔ سورج، چاند دونوں اللہ نے بنائے ہیں، دونوں نظام اللہ تعالیٰ ہی چلا رہے ہیں، لیکن بحیثیت مسلمان ہماری بھی کوئی ڈیوٹی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی؟ اس بارے میں بھی چند باتیں سن لیجیے۔

قمری یعنی ہجری سال اور تاریخ کو یاد رکھنا، باقی رکھنا فرض کفایہ ہے۔ ایک علاقے کے اندر کسی کو کچھ نہیں پتا تو سارے ہی گنہگار رہوں گے، اور کچھ لوگوں کو معلوم ہے تو پھر عمومی گناہ سے تو بچ جائیں گے لیکن دینی حمیت اور غیرت کی بنیاد پر مسلمان کو چاہیے کہ اسلامی تاریخ کو یاد رکھے۔ چوں کہ جن شرعی احکامات کا تعلق چاند کی تاریخوں سے ہے مثلاً زکوٰۃ، روزہ، حج، قربانی وغیرہ تو ان کی تکمیل بھی انہی تاریخوں سے ہے۔ عبادت کو پورا کرنے کے لیے قمری تاریخ کا یاد رکھنا خود ایک عبادت ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھیں کہ قمری تاریخوں کا استعمال کن لوگوں نے کیا؟ انبیاء نے کیا، صحابہ نے کیا، اولیاء نے کیا۔ جب ہم بھی کریں گے تو ہماری نسبت اُن سے ہوگی اور خیر و برکت رہے گی۔

صرف انگریزی تاریخ کو اپنانا مناسب نہیں

قمری حساب کے استعمال سے اسلام کا تشخص باقی رہتا ہے اس لیے بھی ضرورت ہے۔ قمری حساب کو بالکل چھوڑ دینا اور صرف انگریزی حساب کو ہی استعمال کرنا اس بارے میں علماء منع فرماتے ہیں۔ جب آپ کی ضرورت ہے آپ شمسی حساب کو استعمال کررہے ہیں ٹھیک ہے، لیکن قمری حساب کو بالکل چھوڑ بھی مت دو، بلکہ دونوں باتیں معلوم ہونی چاہیے اور اسے لکھنا بھی چاہیے۔ اہلِ مدارس تو اس کا اہتمام کر ہی رہے ہیں۔ البتہ جو نہیں کر رہے، اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ شمسی تاریخ لکھ رہے ہیں تو لکھ لیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اسلامی تاریخ بھی لکھ لیں۔ ہمارے مدرسے کی جو پرچیاں

بنیں گی ابھی تو بن گئی ہیں، آیندہ جو بھی ہوں تو اس میں دونوں تاریخوں کے کالم ڈالے جائیں گے قمری بھی اور عیسوی بھی۔ اسی طرح جہاں جہاں ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم شروع کر سکتے ہیں، تو کرنا چاہیے۔ یا کم سے کم یاد تو رکھ سکتے ہیں پتا تو ہو۔ یہ محبت کا معاملہ ہے۔ یہ بات قمری حساب کے اعتبار سے تھی۔ اب اگلی بات محرم الحرام کے مہینہ کے اعتبار سے ہے۔

محرّم الحرام کی اہمیت

محرّم کے مہینے میں عام طور سے ایک یہ تصوّر ہے کہ محرّم کا تعلق فقط حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور کربلا کے واقعہ سے ہی ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ ان کا واقعہ یقیناً محرّم میں ہوا۔ 10 محرّم میں ہوا۔ بہت بڑی قربانی تھی، وہ سب اپنی جگہ بہت بڑی باتیں ہیں۔ لیکن محرّم سے مراد صرف اسی ایک واقعہ کو لے لینا اور باقی ساری باتوں کو بھول جانا یہ لاعلمی کی بات ہے۔ اس بندے کو دین کا پتا ہی نہیں ہے۔

لغت کے حساب سے محرّم کا مطلب ہے مُعَظّم، محترم، معزّز۔ یہ مہینہ اِعزاز والا ہے، احترام والا مہینہ ہے اسی لیے اس کا نام محرّم ہے۔ ایک حدیث شریف بیان ہوئی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے موقع پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا: اس وقت زمانے کی رفتار وہی ہے جس دن اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ یعنی اب اس کے دنوں اور مہینوں میں کوئی کمی زیادتی نہیں ہے جو جاہلیت کے زمانے میں مشرکین کر دیا کرتے تھے۔ اب وہ ٹھیک ہو کر اس طرز پر آ گئی ہے جس پر ابتدا میں اصل میں تھی۔ اور آگے فرمایا: ایک سال 12 مہینوں کا ہوتا ہے اور ان میں چار مہینے حرمت اور عزّت والے ہیں جن میں تین مہینے مسلسل ہیں: ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرّم اور ایک رجب کا

مہینہ ہے جو جمادی اُخریٰ اور ماہِ شعبان کے درمیان آتا ہے۔ (صحیح بخاری: رقم4662)

مبارک مہینوں کی خصوصیت

اس سے پہلے جو شریعتیں آئیں ان کے اندر بھی ان چار مہینوں کے اندر قتال حرام تھا۔ اور یہ احترام والے دن تھے۔ اور ان مہینوں میں عبادت کا ثواب زیادہ ملتا ہے۔ مفسرِ اعظم امام ابوبکر جصّاص رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر ''اَحکامُ القرآن'' میں فرماتے ہیں کہ ان مبارک مہینوں کی خصوصیت یہ ہے، Quality یہ ہے کہ اِن میں جو بندہ عبادت کرتا ہے اس کو باقی مہینوں کی نسبت زیادہ عبادت کا ثواب ملتا ہے۔ پھر جو بندہ اس میں ہمت کر کے گناہوں سے بچتا ہے اس کے لیے باقی مہینوں میں گناہوں سے بچنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ یہ چار مہینے جس میں محرّم کا مہینہ بھی شامل ہے خاص طور سے عبادت اور خاص طور سے گناہوں سے بچنے کا مہینہ ہے۔ ان مہینوں سے فائدہ نہ اُٹھانا اور اس میں اِدھر اُدھر لگے رہنا یہ بہت نقصان کی بات ہے۔

محرّم الحرام کا روزہ

ایک حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: رمضان کے روزوں کے بعد سب سے بہترین روزے اللہ کے مہینے محرّم کے روزے ہیں۔ (صحیح مسلم: رقم1163)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محرّم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے کہ یہ مہینہ اللہ کا مہینہ ہے۔ باقی مہینے کس کے ہیں؟ باقی بھی اللہ ہی کے ہیں، لیکن اس کو خصوصیت کے ساتھ کہا کہ اللہ ربّ العزّت کا مہینہ ہے، اور اس مہینے میں روزے رکھنے کی فضیلت رمضان کے روزوں کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ اس حدیث میں 10 محرّم کا ذکر نہیں ہے، وہ دوسری حدیث میں ہے۔ تو محرّم کے مہینے میں کسی بھی دن روزہ

رکھنا باعث ثواب ہے۔آپ 10,9 محرّم کورکھیں،20 کورکھیں،25 کورکھیں،5 کو رکھیں۔اس مہینے کی برکت سے زیادہ ثواب ہے۔ہمیں اس کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔اور جو 10,9 محرّم کو یا 11,10 محرّم کو روزہ رکھتا ہے اس کو 10 محرّم کے روزے کی فضیلت بھی ملے گی اور محرّم کی بھی ملے گی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ رمضان کے بعد مجھے کس مہینے میں روزہ رکھنے کا حکم دیں گے؟ حضرت علی نے اس آدمی سے کہا کہ مجھ سے کسی نے یہ سوال نہیں پوچھا جو تم نے پوچھا ہے۔اوراس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں نے سنا ہے۔ایک آدمی نے یہی سوال پوچھا تھا جو تم پوچھ رہے ہو، اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو جواب اسے دے رہے تھے تو میں حاضرِ خدمت تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ماہِ رمضان کے روزے کے بعد اگر تم روزے رکھنا چاہتے ہو تو ماہِ محرّم کے روزے رکھو، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ مہینہ ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے ایک قوم یعنی بنی اسرائیل کی توبہ قبول کی، اور اسی دن دوسرے لوگوں کی توبہ بھی قبول فرمائیں گے۔ (سنن ترمذی: رقم 741)

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(دوسرا حصہ)

محرّم الحرام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ كَفٰى وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَا دِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى. أَمَّا بَعْدُ:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ط﴾ (سورۃالتوبۃ:الآیۃ36)

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

رمضان کے بعد محرّم

محرّم الحرام کی حیثیت شروع ہی سے تقریباً سب ہی مذاہب کے یہاں چلی آرہی ہے۔اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس مہینے میں ہم محنت کریں۔ دن اور رات عبادات کے اندر زیادہ وقت لگانے کی فکر کریں۔محرم الحرام کا مہینہ رمضان المبارک کے بعد عبادت کے لیے بہت بابرکت مہینہ ہے۔اس میں خوب عبادت کرنی چاہیے۔

عاشورہ کے واقعات:

دسویں محرم کو یہودی،عیسائی اورقریشِ مکہ عاشورہ کہتے ہیں۔اس بارے میں مختلف واقعات تاریخ اور حدیث شریف میں ملتے ہیں۔ان میں ایک بات تو یہ ہے کہ اس دن موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے فرعون سے نجات دی تھی۔یعنی اس دن فرعون غرق ہو گیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بچالیا تھا۔اہلِ یہود اس دن روزہ رکھتے تھے،تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب ہوں۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دن روزہ رکھا اور مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا۔

(صحیح بخاری:رقم1900)

رمضان المبارک کے روزے فرض ہونے سے پہلے دسویں محرم کا روزہ ہماری شریعت یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں بھی فرض تھا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دسویں محرم کا روزہ مکہ مکرمہ میں بھی رکھا کرتے تھے۔جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے اس وقت تو بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی 10 محرم کا معاملہ پہلے سے چلا آرہا ہے۔بعض مؤرخین نے چند واقعات اور بھی لکھے ہیں ان کی تفصیل آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے''ماہنامہ'' محرّم الحرام 1436ہجری،مطابق نومبر 2014ء کے شمارے

میں یہ تفصیل بحوالہ چھپ چکی ہے:

یومِ عاشورہ کی تاریخی اہمیت

1. یوم عاشورہ میں ہی آسمان وزمین، قلم اور حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا۔
2. اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔
3. اسی دن حضرت ادریس علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا۔
4. اسی دن حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ہولناک سیلاب سے محفوظ ہوکر کوہِ جُودی پر لنگر انداز ہوئی۔
5. اسی دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''خلیل اللہ'' بنایا گیا اور ان پر آگ گلِ گلزار ہوئی۔
6. اسی دن حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔
7. اسی دن حضرت یوسف علیہ السلام قید خانے سے رہا ہوئے اور مصر کی حکومت ملی۔
8. اسی دن حضرت یوسف علیہ السلام کی حضرت یعقوب علیہ السلام سے ایک طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔
9. اسی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم واستبداد سے نجات حاصل ہوئی۔
10. اسی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی۔
11. اسی دن حضرت سلیمان علیہ السلام کو بادشاہت واپس ملی۔
12. اسی دن حضرت ایوب علیہ السلام کو سخت بیماری سے شفا نصیب ہوئی۔
13. اسی دن حضرت یونس علیہ السلام چالیس روز مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے بعد نکالے گئے۔
14. اسی دن حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی توبہ قبول ہوئی اور اُن پر سے عذاب ٹلا۔

15 اسی دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

16 اسی دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کے شر سے نجات دلا کر آسمان پر اُٹھایا گیا۔

17 اسی دن دنیا میں پہلی بارانِ رحمت نازل ہوئی۔

18 اسی دن قریش خانۂ کعبہ پر نیا غلاف ڈالتے تھے۔

19 اسی دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔

20 اسی دن کوفی فریب کاروں نے نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جگر گوشۂ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میدانِ کربلا میں شہید کیا۔

20 اور اسی دن قیامت قائم ہوگی۔

(نزہۃ المجالس: ۱/ ۳۴۷، ۳۴۸۔ معارف القرآن: پ ۱۱ آیت ۹۸۔ معارف الحدیث: ۴/ ۱۶۸)

اس کے علاوہ بھی واقعات دسویں محرّم کے بارے میں آتے ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ یہ تاریخی واقعات ہیں جو سنداً کمزور بھی ہو سکتے ہیں۔ اللہ اعلم!

کم علمی کی باتیں:

خلاصہ یہ کہ دس محرّم کی حیثیت پچھلی شریعتوں سے چلی آرہی ہے، اس کو فقط ایک واقعے سے مخصوص کر دینا غلط ہے۔ دیکھیے! ہم واقعہ کربلا کی کسی بات سے انکار نہیں کر رہے ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بہت بڑا رتبہ، اور بہت بڑی قربانی ہے۔ لیکن باقی ساری شریعت کو چھوڑ کر ایک ہی چیز کو سامنے رکھ لینا اور سارا دین اس کے ساتھ جوڑ دینا یہ کمعلمی کی بات ہے۔ اب ہمارے ہاں دس محرّم کو کیا ہوتا ہے؟

کہیں کھیر بنتی ہے۔

کہیں حلیم بنتی ہے۔

کہیں پانی کی سبیل لگتی ہے۔
کہیں شربت کی سبیل لگتی ہے۔
کہیں کالے چنے، اور کہیں سفید چنے تقسیم ہوتے ہیں۔

آپ جو چاہیں بنائیں، لیکن اس دن کے ساتھ مخصوص کر دینا کہ یہ ڈش اسی دن بنانی ہے، یہ ایک عجیب سی بات ہے۔ بعضوں کے یہاں ایک اور بھی رسم ہے۔ وہ یہ کہ شادی کے بعد جو پہلا مہینہ محرّم کا آتا ہے تو بیوی کو اس کی ماں کے ہاں چھوڑ آتے ہیں۔ یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی طرح کہیں پر روٹیاں پکا کر پھینکی جاتی ہیں۔ روٹی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اسے پھینکنا ویسے ہی گناہ ہے، یہ تو عزت کرنے کی چیز ہے۔

سوال یہ ہے کہ پھر ہم دسویں محرّم کو ہم کیا طریقہ اختیار کریں؟ جواب آسان ہے۔ جو طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا، اسی کو اختیار کرنے میں ہمارے لیے نجات ہے۔

دسویں محرّم کا روزہ:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی خاص دن کا روزہ اہتمام سے رکھتے ہوں، اور اس کو کسی دوسرے دن پر فضیلت دیتے ہوں سوائے دس محرّم کے دن یا رمضان۔ (صحیح بخاری: رقم 1902)

یعنی رمضان کے مہینے میں روزے بہت اہتمام کے ساتھ رکھتے تھے، اور دسویں محرّم کا روزہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پورے اہتمام کے ساتھ رکھتے تھے۔ کسی اور دن کے روزے کا اتنا اہتمام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ ہم 10 محرم کو روزہ رکھیں۔

دوسری حدیث حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ

ارشاد فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ عاشورہ یعنی 10 محرم کا روزہ گزشتہ یعنی ایک سال پہلے کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔ (صحیح مسلم: باب استحباب صیام ثلاثۃ أیام من کل شھر و صوم یوم عرفۃ و عاشوراء و الاثنین و الخمیس)

صغائر کی معافی:

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ 10 محرّم کے روزے کی فضیلت میں گناہوں کی معافی کا جو ذکر ہوا ہے، اس سے مراد صغائر ہیں۔ صغیرہ گناہ بھی معاف ہو جائیں تو بہت بڑی بات ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد صاحب حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ اعمال اگر توبہ کی نیت سے کیے جائیں تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہ بھی معاف فرما دیں۔

کبیرہ گناہ کی معافی:

کبیرہ گناہ توبہ کے ذریعہ سے معاف ہوتا ہے اور اس کے لیے 3 شرائط ہیں:

ندامت: جو گناہ کر چکا اس پر شرمندگی ہو۔

ترکِ گناہ: فوراً سے اس گناہ کو چھوڑ دے۔ یعنی اس سے ہٹ جائے۔

عزم علی الترک: آیندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا پکا ارادہ کرے۔

بعد میں اگر گناہ پھر ہو جائے تو پھر دوبارہ سے توبہ کر لے۔ توبہ کرتے وقت گڑبڑ نہ ہو۔ شیطان یہاں گڑبڑ ڈال دیتا ہے۔ توبہ کرتے وقت یہ یقین ہو کہ اس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں۔

بعض کوتاہیوں کا اِزالہ:

بعض حضرات ایسے ہیں جو 10 محرم کے روزے کو اتنی فضیلت دیتے ہیں کہ نمازیں

چھوڑ دیتے ہیں، گناہوں میں بھی لگے رہتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہیں کہ اس روزے کو ہی نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ دسویں محرم کا روزہ کچھ نہیں۔ عجیب عجیب معاملات ہیں۔ ہم پیارے نبی ﷺ کی زندگی کو دیکھیں کہ اس میں ہمارے لیے کیا راہنمائی ہے۔ امیر المؤمنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اپنی خلافت کے زمانے میں حج سے واپسی پر عاشوراء کے دن مدینہ منورہ تشریف لائے۔ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا: اے اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے: یہ عاشورہ 10 محرم کا دن ہے اور تمہارے اوپر اس دن کا روزہ فرض نہیں کیا گیا، لیکن میں روزے سے ہوں، تو جو شخص روزہ رکھنا چاہے وہ رکھ لے، اور جو نہ رکھنا چاہے وہ نہ رکھے۔ (صحیح بخاری: باب صیام یوم عاشوراء)

ایک حدیث شریف شروع بیان میں ذکر کی تھی کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرّمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے، تو آپ ﷺ نے یہودیوں کو 10 محرم کے دن روزے رکھتے دیکھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اس دن کی تمہارے ہاں کیا خصوصیت ہے؟ یعنی تم اس دن روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ بڑا عظیم دن ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا تھا۔ چناں چہ ہم شکرانے کے طور پر اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے مقابلے میں ہم موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قریب ہیں (کیوں کہ تم تو ان کے احکامات کو بھلا چکے ہو، ان کی شریعت کو بدل چکے ہو، اور ہم ملت ابراہیمی پر ہیں تو ہم تم سے زیادہ اس بات کے حق دار ہیں کہ اس دن کا روزہ رکھیں) چناں چہ آپ ﷺ نے خود بھی 10 محرم کا روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی تلقین فرمائی۔

(صحیح بخاری: رقم 1900)

جیسا کہ بات گزری کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرّمہ میں یہ روزہ رکھتے تھے۔ رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کے بعد عاشوراء کے روزے کی فرضیت کی منسوخی کا اعلان فرما دیا۔لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر بھی رکھا اور یہ بھی فرما دیا کہ کوئی رکھنا چاہے تو رکھے، نہ رکھنا چاہے تو نہ رکھے۔

یہود ونصاریٰ کی مشابہت سے بچنا:

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحبت یافتہ تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو اور شریعت کے مزاج کو پہچاننے والے تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ ایک ایسا دن ہے کہ یہود ونصاریٰ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ اسی دن اگر ہم بھی روزہ رکھیں گے تو مشابہت ہو جائے گی (حالاں کہ ہمارے اوران کے درمیان بڑا فرق ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آیندہ سال اِن شاء اللہ ہم نویں محرّم کا روزہ ساتھ رکھیں گے۔ راوی حدیث کہتے ہیں کہ اگلا سال (محرّم) آنے سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے پردہ فرما گئے۔ (صحيح مسلم: باب أي يوم يصام في عاشوراء)

ایک دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عاشوراء کا روزہ رکھو، اور اس میں تم یہود کی مخالفت کرو، (عاشوراء سے) ایک دن پہلے کا روزہ رکھو یا ایک دن بعد کا (یعنی عاشوراء کے ساتھ نویں یا گیارہویں کا روزہ ساتھ ملالو)۔ (مسند احمد: رقم 2155)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر ذرا غور کریں کہ روزہ رکھنا کیا ہے؟ عبادت ہے۔ اور پہلے سے چلا آ رہا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں بھی روزہ رکھا کرتے تھے، لیکن جب مدینہ طیبہ میں آئے اور یہ معلوم ہوا کہ یہودی بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں تو

آپ ﷺ نے عبادت کرنے کا تو حکم دیا لیکن ساتھ میں مخالفت کا بھی حکم دیا۔ اسلام کی غیرت برداشت ہی نہیں کرتی کہ کلمہ پڑھنے والا، اللہ کو ایک ماننے والا، رسول اللہ ﷺ پر یقین رکھنے والا، آپ ﷺ کو اپنا نبی ماننے والا کسی غیر کے طریقے پر چلے۔ یہ اسلام کی غیرت اور حمیت برداشت نہیں کرتی، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر نہیں بلکہ کتنے ہی موقعوں پر یہ بیان فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکوں اور مجوسیوں کی مخالفت کرو۔ گلدستہ سنت جلد دوم آپ پڑھیں، اِن شاء اللہ بہت ساری مشابہت کی باتیں آپ کو اس میں مل جائیں گی۔ مختصراً عرض ہے۔

شیطان کے دوستوں کی مخالفت کیجیے:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مشرکین پاجامہ تو پہنتے ہیں، لیکن لنگی نہیں باندھتے۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم پاجامہ بھی پہنو اور لنگی بھی باندھو۔ اور جس قدر ہو سکے شیطان کے دوستوں کی مخالفت کرو۔

(مجمع البحرین فی زوائد المعجمین: رقم 4227)

اور واضح سی بات ہے کہ کفار شیطان کے دوست ہیں۔ حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ کی تفصیلی حدیث میں اہلِ کتاب کی مخالفت کا ذکر ہے۔ (مسند احمد: رقم 21695)

حضرت ابو کریمہ مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا۔ آپ رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے: اے لوگو! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم راہبوں اور پادریوں کے لباس سے بچو، اس لیے کہ جس نے رہبانیت اختیار کی یا اس کی مشابہت کی، وہ مجھ سے نہیں۔

(مجمع البحرين في زوائد المعجمين: رقم 4226)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ. (سنن أبي داود: رقم3512)

ترجمہ: ''جس نے جس کی مشابہت کی وہ اسی میں سے ہوگا''۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ مراد اس سے ظاہری لباس، اور ظاہری کاموں میں کفار کی مشابہت سے بچنا ہے۔

سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ:

حضرت فاروق اعظم امیر المؤمنین ثانی رضی اللہ عنہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے تھے۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔ (سنن ترمذی: رقم3686)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یقیناً اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان اور دل پر جاری کر دیا ہے۔ (سنن ترمذی: رقم3682)

صحیح بخاری (رقم: 3294) اور صحیح مسلم (رقم: 2396) میں بروایت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! (اے عمر) جس راستے سے شیطان تمہیں چلتا ہوا دیکھتا ہے وہ اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: میں انسانوں اور جنات کے شیاطین کو دیکھتا ہوں کہ عمر سے بھاگتے ہیں۔

(سنن ترمذی: رقم3691)

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے عمر! حقیقت یہ ہے کہ شیطان تم سے ڈرتا ہے۔ (سنن ترمذی: رقم3690)

اللہ اکبر کبیراً! کتنے فضائل ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے۔ ان کے دورِ خلافت میں جب فتوحات کا دروازہ کھلا اور بہت ساری مختلف قومیں مسلمان ہونے لگیں تو کچھ چیزوں کے خلط ملط ہونے کا خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں عجمیوں کے رسوم ورواج مسلمانوں میں نہ آجائیں۔ جیسے ہم پاکستان میں رہتے ہیں اور ہماری شادیوں میں ہندوؤں کی بہت ساری چیزیں موجود ہیں۔ آپ سعودیہ عرب چلے جائیں، افریقہ کے ممالک میں چلے جائیں، وہاں یہ چیزیں آپ کو نہیں ملیں گی۔ یہ اُبٹن، مایوں، مکلاوا، گود بھرائی اور اس طرح کی دیگر چیزیں ہندوانہ رسمیں ہیں۔ ایک مرتبہ مجھے کچھ ساتھیوں نے بتایا کہ آپ نے تو چند ہی نام لیے ہیں، اتنے سارے تو آپ بھول چکے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے پتا ہی نہیں تو بھولنا کیا ہے۔ ہندوستان ہمارے بہت قریب ہے، کئی مسلمان وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں، پہلے ہندوؤں کے ساتھ ہی رہن سہن تھا، اس لیے بہت ساری چیزیں ان کی ہمارے اندر آگئیں۔

بہر حال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی یہ خطرہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ نئی نئی عجمی قومیں جو مسلمان ہو رہی ہیں، ایمان قبول کر رہی ہیں تو ان کی گزشتہ چیزیں یا رواج مسلمانوں کے اندر آجائیں۔ اس پر انہوں نے حکم جاری کیا اور تمام ماتحت علاقوں میں خط بھیجا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوعثمان نہدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے کہ ہماری (مسلمانوں کی) جماعت آذربائیجان میں حضرت عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ ہمارے پاس امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خط آیا جس میں دیگر کئی احکامات کے منجملہ یہ بھی تھا:

وَعَلَيْكُمْ بِلِبَاسِ أَبِيْكُمْ إِسْمَاعِيْلَ ، وَإِيَّاكُمْ وَالتَّنَعُّمَ ، وَزِيَّ الْعَجَمِ.

ترجمہ: ''تم پر لازم ہے کہ اپنے باپ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا لباس پہنو، اور عیش وعشرت

کی زندگی اور عجمیوں کی مشابہت سے بچو''۔

(شرح السنہ: رقم 3019)

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مطہرہ کو زندگی کے ہر شعبے میں اختیار کریں۔

داڑھی رکھنا:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مشرکوں کی مخالفت کرو، داڑھی کو بڑھاؤ، اور مونچھوں کو کٹواؤ۔ (صحیح بخاری: رقم 5553)

تاکہ اُن سے مشابہت نہ ہو۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ حدیث شریف کی شرح میں لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں مجوس کی مخالفت کا ذکر ہے۔

سحری کرنا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سحری کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: سحری کرو، اس لیے کہ سحری (کھانے) میں برکت ہے۔

(صحیح بخاری: رقم 1923، صحیح مسلم: رقم 1095)

اہلِ کتاب جب روزہ رکھتے تو سحری نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ہمارے روزے اور اہلِ کتاب کے روزے کے درمیان سحری کھانے کا فرق ہے (کہ وہ سحری کیے بغیر روزہ رکھتے ہیں، اور مسلمان سحری کر کے روزہ رکھتے ہیں)۔ (صحیح مسلم: رقم 1096)

اس باریکی کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا اور پھر اُمت کو بتایا۔ اسی طرح طلوعِ آفتاب، زوالِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے وقت سجدہ کرنے سے منع کیا۔ کیوں؟ اس

لیے کہ بہت ساری قومیں اس موقع پر سورج کی طرف متوجہ ہو کر عبادت کر رہی ہوتی ہیں۔تو مسلمانوں کو منع کیا گیا تا کہ مسلمان اپنے طور طریقوں کو برقرار رکھیں اور کسی طریقے سے بھی غیروں کے طریقے پر نہ جائیں۔مشابہت بالکفار سے بچنا بے حد ضروری ہے،اور یہ اللہ تعالیٰ کی غیرت کا معاملہ ہے۔

ایک فکری سوال:

ایک فکری سوال ہے۔کوئی پاکستانی فوجی انڈین آرمی کے لباس میں آجائے۔ پاکستان آرمی کا نوجوان ہو اور انڈین آرمی کے لباس میں اگر بالفرض آجائے۔آپ اسے محبت کی نگاہ سے دیکھیں گے یا غصے کی نگاہ سے دیکھیں گے؟ لامحالہ غصے کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ ایسا کیوں؟ لباس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ قسمیں کھائے، کلمے پڑھے کہ پاکستان کے آئین کی میں پوری لاج رکھوں گا، پاکستان کے لیے میں جان دے دوں گا، اندر سے میں پورا پاکستانی ہوں۔ بتائیے کہ آپ اس کو کیا درجہ دیں گے؟ آپ اس کی کوئی بات نہیں مانیں گے۔ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تم دشمن کے روپ میں نظر آرہے ہو۔غور کیجیے کہ کیا مسلمانوں کا کوئی تشخص نہیں ہے؟ ان باتوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔لباس کے اندر ہم اپنے آپ کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں پھر ان شاءاللہ آسانی ہوگی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمت کو ہمیشہ یہود و نصاریٰ کی مشابہت سے منع کیا ہے۔ آخر کب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں کو مانیں گے۔ قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شکل دکھانے کے لائق ہیں بھی یا نہیں؟ شفاعت کے لیے کس کے پاس جائیں گے؟ کون سے چہرے لے کر جائیں گے؟ کونسا لباس پہن کر جائیں گے؟ لباس کے بارے

میں گلدستہ سنت جلد 2 میں بہت تفصیل ہے۔اس کو ضرور پڑھیں،اوراپنے لباس کوٹھیک کریں،اپنی اولادوں کے لباس کوٹھیک کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی اولاد کا لباس کم ہوتا چلا جارہاہے۔کہیں ایسا تونہیں کہ پندرہ بیس سال کے بعد جوآج یورپ کا لباس ہے،جس Track پرہم چل پڑے ہیں وہ لباس نظر آئے گا؟مسجدیں اور مدارس ختم ہو جائیں گے،کلب اور نائٹ پارٹیز کے اڈے کھل جائیں گے۔جوراستہ ہم نے پکڑا ہوا ہے،معاذ اللہ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

غلط دیکھنے کے غلط اثرات:

آج کے میڈیا، اور بے ہودگی کے پروگرامز کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں گے تو نقصان تو ہوگا۔میاں بیوی کے درمیان طلاق ہوچکی، پھربھی ساتھ بیٹھے ہیں تو یہ حرام ہے۔یہ کہاں سے سیکھ رہے ہیں؟ کون سکھا رہا ہے؟ کہتے ہیں کہ اولاد کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔سوچیے کہ جس کی وجہ سے کر رہے ہیں،کل کو ان کا کیا حال ہوگا؟ جو غلط دیکھ رہے ہیں،اس کے غلط اثرات زندگی پر پڑتے ہیں۔دین اسلام میں الحمد للہ،ثم الحمد للہ! کسی چیز کی کمی نہیں ہے کہ ہنود و یہود و نصاریٰ کے پروگرامز دیکھ کر اس کمی کو پورا کریں۔ ہمیں چاہیے کہ کبیرہ گناہ کو کبیرہ گناہ سمجھیں اور اس سے بچیں۔اللہ تعالیٰ اس کی سمجھ عطا فرمائے آمین۔

اچھا سوچیں:

ہم اپنی آخرت کی فکر کریں اور مشابہت سے بچیں۔ 10 محرم کا جب دن آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کو یاد رکھ لیجیے گا کہ 10 کے ساتھ 9 یا 11 کو ملانا ہے۔ پھر 9 یا 11 کو جب روزہ رکھیں تو سوچیں کہ کیوں میں آج روزہ رکھ رہا ہوں؟ اس

لیے رکھ ہوں کہ مجھے یہود کی مخالفت کرنی ہے، غیروں کی مخالفت کرنی ہے۔ پھر سوچیں کہ کیا ایک روزے کے معاملہ میں ہی کرنی ہے؟ اور باقی معاملوں میں چھوٹ ہے؟ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جانا ہوگا۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی اور دیگر حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا آمنا سامنا ہوگا تو پتا نہیں کہ یہ حضرات ہمیں مسلمان قبول بھی کریں گے یا نہیں۔ رسوم و رواج کے لیے جان دینا ہمارے لیے آسان ہوگیا ہے، اور سنت پر عمل مشکل۔ کسی کو کہو کہ سنت کے مطابق شادی کرلو، تمہاری شادی میں کوئی گناہ نہیں ہونا چاہیے۔ جواب کیا آتا ہے؟ ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے آمین۔

عاشوراء کے دن وسعتِ رزق:

عاشوراء کے دن اپنے گھر والوں پر رزق میں وسعت کے بارے میں چند باتیں بیان کی جارہی ہیں۔

پہلی بات: اس سلسلے میں جتنی روایات بھی منقول ہیں، وہ ضعف سے خالی نہیں۔

دوسری بات: یہ سب روایات مل کر قابلِ عمل ہوتی ہیں محدثین کے نزدیک۔

یہ دونوں باتیں کتاب ''ما ثبت بالسنۃ'' کے صفحہ 17 پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی m (متوفّٰی 1052 ہجری) نے تحریر کی ہیں۔

اب وہ روایات بیان کی جارہی ہیں کہ جس میں یوم عاشوراء پر رزق وسیع کرنے کا ذکر ہے۔

1. حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ وَسَّعَ عَلَى عِيَالِهِ يَوْمَ عَاشُورَاءَ لَمْ يَزَلْ فِي سَعَةٍ سَائِرَ سَنَتِهِ.

(المعجم الكبير: رقم 9868)

ترجمہ: ''جس نے اپنے گھر والوں پر عاشوراء (دسویں محرم) کے دن وسعت کی، وہ پورے سال کشادگی میں ہوگا''۔

2 حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

من وسّع على نفسه وأهله يوم عاشوراء وسّع الله عليه سائر سنته.

قال جابر: جرّبناه فوجدناه كذلك. (الاستذكار لابن عبدالبرّ: 10\140)

ترجمہ: ''جو اپنے آپ پر اور اپنے گھر والوں پر عاشوراء (دسویں محرّم) کے دن وسعت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس پر پورے سال وسعت فرمائیں گے''۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہم نے اس کا تجربہ کیا، تو اس کو ایسا ہی پایا''۔

3 سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

من وسّع على أهله ليلة عاشوراء وسّع الله عليه سائر سنته.

(الاستذكار لابن عبدالبرّ: 10\140)

ترجمہ: ''جس نے اپنے گھر والوں پر عاشوراء کی رات کشادگی کی، اللہ تعالیٰ پورے سال اس پر کشادگی فرمائیں گے''۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت ہی عظیم محدث گزرے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے عاشورہ کے دن وسعت کرنے کا تقریباً پچاس سال یا ساٹھ سال تجربہ کیا (ایک روایت کے مطابق) اس کو بہترین پایا (دوسری روایت کے مطابق) صحیح پایا۔

(مسائل ابن هانئی للامام أحمد: 1/136-137)

وسعت گھر والوں پر کیجیے، نہ کہ کسی اور پر:

اس پورے کلام کے بعد یہ بات تو سو فیصد معلوم ہوگئی کہ وسعت کی ترغیب گھر والوں کے لیے ہے، نہ کہ ساری دنیا والوں کے لیے۔ نبی کریم ﷺ نے جتنا بتایا ہے ہم اتنا ہی سمجھیں یعنی اپنے پر اور اپنے گھر والوں پر۔ اب اگر کوئی لوگوں کو کھلانا چاہے، تو منع نہیں ہے لیکن اس کے لیے 10 محرّم کی تخصیص ٹھیک نہیں ہے۔ آپ مدرسے میں طلبا کو، غربا کو، رشتہ داروں کو جب مرضی ہو کھلائیں۔ اس کے لیے 10 محرم ہی کا دن مخصوص کرنا صحیح نہیں ہے۔

عمل بقدر ہمت:

اب بات یہ ہے کہ دوسروں کو عاشوراء کے علاوہ کیا کھلائیں؟ کیا بریانی کی دیگ، حلیم کی دیگ وغیرہ کا ہونا ضروری ہے؟ اَلمیہ یہ ہے کہ ساری زندگی بہت کچھ دنیا کے تجربے، اور لوگوں کے مزاج کو سمجھنے میں لگا دیتے ہیں، لیکن شریعت کا مزاج سمجھنے لیے، اور دین کو سمجھنے کیلئے کے لیے کوئی وقت نہیں دیتا الا ماشاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کی بناوٹ ایسی رکھی ہے کہ جتنے نیک کام کرنے کا اس کو حکم دیا گیا ہے، اُن سب کے کرنے کی اس میں صلاحیت ہے۔ جیسے نماز پڑھنے کی، روزہ رکھنے کی، مال ہے تو زکوٰۃ ادا کرنے کی صلاحیت وغیرہ۔ اور جتنے گناہوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس بدن میں سے رکنے کی طاقت ہے کوئی پہلوان استعمال تو کرے۔ اسی طرح اوروں کو کھانا کھلانے میں کوئی لمبا چوڑا حکم نہیں ہے، بلکہ جیسی جس کی ہمت ہے اس کے حساب سے اپنی صلاحیت کو بروئے کار لائے۔ مثلاً گھر میں فروٹ زیادہ آ گیا، کھانا تھوڑا زیادہ بنالیا، یا کوئی مناسب کپڑا استعمال میں نہیں آ رہا تو اِن سب صورتوں میں ہم دوسروں کو ہدیہ

دے کر اُن کا دل جیت سکتے ہیں۔ کوئی واہ واہ نہیں، کوئی تعریفوں کے پُل باندھنے والی بات نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جتنا کر سکتے ہیں اتنا کریں۔

خدمتِ خلق میں مبالغہ آرائی سے گریز:

اس کھانا کھلانے میں، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے میں عام طور پر یہ دھوکہ لگ جاتا ہے کہ جی ہم بہت بڑا کام کر رہے ہیں، اب باقی تمام دین سے چھٹی۔ سارا سال فجر نہیں پڑھنی، اور باقی نمازیں بھی مرضی ہوئی تو پڑھ لی۔ سودی نظام چلا رہے ہیں۔ اور اس کے لیے لوگوں سے اُن کا مال لے رہے ہیں، اور من مرضی سے استعمال کر رہے ہیں۔ ان سب کے بعد کیا ساری شریعت ختم ہو جائے گی؟ بھئی! ہر عبادت کا حکم اپنی جگہ ہے۔ عبادات کو آپس میں ٹکرانے کی کوشش نہ کریں۔ ہر عمل کو اس کے درجے میں کریں جس درجے میں وہ ہے۔

واقعہ کربلا میں اعتدال:

جب ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات اور اُن کی بہترین دینی تربیت کا مطالعہ کریں گے، تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگی کہ دینِ اسلام میں اعتدال کا بہت اہتمام ہے۔ اور اِفراط وتفریط سے بچنا ہے۔ 10 محرّم کی حرمت اور عزت صرف واقعہ کربلا کے ساتھ نہیں ہے، یہ تو گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کے زمانے سے چلتی آ رہی ہے اور قیامت تک رہے گی۔ چناں چہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت جو 10 محرّم کو ہوئی، وہ اہلِ بیت میں سے ہیں۔ اُن کا بہت بڑا مقام ہے۔ ان کے مقام کے بارے میں رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ کمی کر دی تو نقصان ہو جائے گا۔ اپنے ایمان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اُن کا مقام بہت بلند، قربانی بہت عظیم ہے۔ ہم یوں کہیں گے کہ اس عظیم

قربانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے عظیم شخصیت کو عظیم دن میں فضیلت دی۔ قربانی بھی عظیم، خاندان بھی عظیم، شخصیت بھی عظیم، واقعہ بھی عظیم، اور اس عظیم واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے عظیم دن کے ساتھ نسبت دے دی۔ اگر پانچ دن پہلے یا پانچ دن بعد یہ واقعہ ہوتا، تب بھی 10 محرّم کی عظمت اور عزّت اپنی جگہ رہتی۔ صحابہ کرام اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کا بڑا مقام ہے، ہم کسی کی بھی عظمت میں کمی نہیں کر سکتے۔

غلط فہمی کا ازالہ:

بعض لوگ محرّم کے مہینے کو منحوس سمجھتے ہیں اور اس مہینے میں شادی نہیں کرتے۔ یہ معاملہ بھی لاعلمی کی وجہ سے ہے۔ قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ کوئی دن، کوئی وقت اور کوئی بھی زمانہ منحوس نہیں ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بنی آدم مجھے ایذا دیتا ہے یعنی میری شان کے خلاف بات کہتا ہے۔ وہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے حالاں کہ زمانہ تو میں خود ہوں یعنی زمانہ میرے تابع ہے اور میرے ماتحت ہے، میرے ہی قبضہ قدرت میں ہے۔ اور میں ہی رات اور دن کو پلٹتا ہوں۔

(صحیح بخاری: رقم 4826، صحیح مسلم: رقم 2246)

اس لیے کسی بھی دن یا مہینے کو منحوس سمجھنا مناسب نہیں۔ نحوست کا دن کسی بھی شخص کے حق میں وہ ہے جس دن کی اس کی فجر چلی گئی، تلاوت نہیں کی، پورا دن گزر گیا اور کچھ گھڑی بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کیا۔ اس لیے جب محرم الحرام کی عظمت دل میں ہوگی تو کسی طور سے کوئی اسے نحوست کی طرف منسوب نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا خیال اور رجحان یہ ہوگا کہ اس عظمت والے مہینے میں شادی کرنے سے تو برکت ہوگی۔ شروع میں ماہنامہ دار العلوم دیوبند سے یہ بات عرض کی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُمّ المؤمنین

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا نکاح محرّم الحرام کے مہینے میں ہوا ہے۔ اس سے بڑی دلیل اور کیا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ ربّ العزّت ہمیں دونوں جہاں کی عزّتیں اور برکتیں عطا فرمائے۔ یہ بارہ کے بارہ مہینے اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اس میں ہم اللہ تعالیٰ کو منانے کی فکر کریں۔ یہ تو آدمی جانتا ہے کہ کب اس دنیا میں وہ آیا ہے، لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ کب اس دنیا سے واپس جائے گا۔ اس لیے نافرمانی والی زندگی کو چھوڑ کر فرماں برداری والی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

واقعہ کربلا اور مزاجِ صحابہ رضی اللہ عنہم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ كَفٰى وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى. أَمَّا بَعْدُ:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (سورۃ فصلت: الآیۃ 30)

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَ سَلِّمْ

کامیاب لوگوں کی باتیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور وہ

جم گئے ڈٹ گئے، ان کی طرف فرشتے بھیجے جائیں گے جو (اُن سے کہیں گے کہ) ڈرو نہیں، غم مت کرو۔ اور انہیں اس جنت کی بشارت دیں گے جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (اور یہ فرشتے یہ بھی کہیں گے کہ) ہم دنیا میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی۔ (سورہ فصلت:30)

دوسری جگہ شہید کے بارے میں ارشادِ باری عزّ تعالی ہے: اور جو میرے راستے میں قتل (شہید) ہو جاتے ہیں، تم انہیں ہرگز مردہ مت سمجھنا۔ بلکہ وہ زندہ ہیں، انہیں اپنے ربّ کے پاس رزق ملتا ہے۔ (سورہ آل عمران:169)

ایک اور جگہ ارشادِ باری ہے: اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوں ان کو مردہ نہ کہو، دراصل وہ زندہ ہیں، مگر تم کو (ان کی زندگی کا) احساس نہیں ہوتا۔ (سورہ بقرہ:154)

واقعہ کربلا ہمیں شہدائے اسلام کی تاریخ یاد دلاتا ہے۔ ہمیں اس واقعہ کو مزاجِ صحابہ کرام j میں تلاش کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور تربیت نے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج کیسا بنا دیا تھا؟ اس کو سمجھنے کی آج اشد ضرورت ہے۔ اگر ہم ان باتوں کو سمجھ لیں گے تو واقعہ کربلا خود بخود سمجھ آ جائے گا۔

مزاج میں اعتدال: (۱)

جس طرح واقعہ کربلا میں سرفروشانِ اسلام کی قربانیوں کا ذکر ہے، اسی طرح واقعہ کربلا سے پہلے اور بعد کے واقعات بھی اس سے تسلسل رکھتے ہیں۔ جب ہم اس نکتے کو اپنے سامنے رکھیں گے تو اِفراط وتفریط سے نکل کر اعتدال پر آئیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتلایا تھا کہ انسان کا مال بھی اللہ کا اور اس کی جان بھی اللہ کی ہے اور جب کبھی اس کی ضرورت پیش آئے تو اسے اللہ کی راہ میں قربان کر

دیں۔ غزوۂ بدر، غزوۂ اُحُد سے لے کر شہادتِ حضرت عمر و حضرت عثمان i، اور واقعہ کربلا، مشرق ومغرب، شمال وجنوب میں پیش قدمی کرتے اسلامی لشکر یہ بتاتے ہیں کہ مسلمان نے اللہ کی راہ میں اپنی جان بھی قربان کی ہے، اور اپنا مال بھی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جذبہ شہادت:

اگر آج ہم خود کو دیکھیں تو جان دینا تو دور کی بات ہے، ہم اپنا بہترین پسندیدہ سوٹ کسی کو دینا پسند نہیں کرتے۔ مال دینا بہت مشکل ہے، اور جان دینا تو اس سے بھی بہت بڑی بات ہے۔ جبکہ مؤمن اللہ کی رضا اور دیدار کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے پر تیار ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایسی تربیت کی تھی کہ تمہارا مال، تمہاری جانیں، تمہاری اولاد سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ کہیں کوئی موقع ملے جان قربان کرنی پڑے تو جان، اور مال کی قربانی دینی ہو تو قربان کر دیں۔ اِن قربانی دینے والے شہداء کی لمبی فہرست ہے۔ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہادت کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے تڑپتے تھے، شہادت مانگتے تھے۔ جہاں محسوس ہوتا کہ یہ قبولیتِ دعا کا موقع ہے وہاں مانگتے تھے کہ اللہ! شہادت عطا فرما دیجیے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ مانگتے تھے:

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ ، وَاجْعَلْ مَوْتِيْ فِيْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (تغليق التعليق لابن حجر: رقم686)

ترجمہ: ''اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا فرما، اور میری موت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر میں کر دے''۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص اس بات کا اہتمام فرماتے تھے۔ جیسے ہماری تمنا یہ ہوتی ہے کہ کاش! ہمارے پاس اتنا مال ہوتا جتنا قارون کے پاس تھا۔ بس ہماری تمنا اور

خواہشات تو مال بڑھانے اور اس میں اضافے کے لیے ہیں۔ اور وہ اللہ کے نیک بندے ایسے تھے جنہوں نے اپنی دنیاوی تھوڑی سی زندگی کو آخرت کے بڑے فائدے کے لیے قربان کر دیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بچوں کا جذبہ شہادت:

کسی غزوے کے موقع پر دو نوعمر لڑکے آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کو اس کی صحت وغیرہ دیکھ کر قبول کر لیا اور دوسرے کو قبول نہیں کیا۔ دوسرے نے عرض کیا کہ آپ مجھے بھی قبول فرمالیں، میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے جس کو قبول کیا ہے وہ قد میں مجھ سے بے شک بڑا ہے، مگر میں طاقت میں اس سے زیادہ ہوں۔ آپ میرا اور اس کا مقابلہ کروا دیجیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت ایک مقابلے کا انعقاد کیا اور دونوں کے درمیان مقابلہ کروایا گیا۔ دونوں بچے سامنے کھڑے ہوئے۔ چھوٹے نے بڑے سے کہا کہ بھائی! آپ تو منتخب ہو گئے ہو مگر اب میرا خیال کرتے ہوئے ایک مہربانی کرو کہ جب میں آپ کو گراؤں تو آپ گر جانا، اس طرح میں جیت جاؤں گا۔ تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے بھی منتخب کر کے ساتھ لے جائیں گے۔ چناں چہ چھوٹا غالب آ گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں کو جہاد میں جانے کی اجازت دے دی۔

اس وقت ماؤں کی تربیت کچھ ایسی تھی کہ اُن کے بچے بھی اس دین پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ اس وقت کسی پکنک یا کسی مال میں گھومنے پھرنے یا سیر کے لیے نہیں جا رہے تھے، بلکہ جہاد پر جانے کی تیاری تھی۔ جب صِغار صحابہ کا یہ حال تھا تو کِبار صحابہ کے کیا جذبات ہوں گے۔ ان کی تربیت اور ان کا شوق انہیں راتوں کو جاگنے پر مجبور کرتا تھا کہ رو رو کر اللہ سے مانگا کرتے تھے کہ اللہ! ہمیں اپنے دین کی

خاطر قبول فرمالے اور ہمیں شہادت کے اعلیٰ درجات عطا فرما۔

حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ:

ایک ٹانگ سے معذور تھے۔غزوۂ اُحد کے موقع پر جب جہاد کا اعلان ہوا تو ان کے گھر سے ان کے چار بیٹے جہاد کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ بیٹوں نے باپ کو روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے بھی جانا ہے۔ بیگم نے ہمت بڑھانے کے لیے دوسرے انداز میں کہا: آپ کیا جائیں گے! آپ تو تلوار دیکھتے ہی بھاگ آئیں گے۔ بیوی کی بات سنتے ہی فرمایا: اِن شاء اللہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ پھر اللہ سے دعا کی کہ اللہ! میں اس جہاد میں شہید ہونا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری لاش بھی واپس نہ لائی جائے۔ یعنی شہید ہو کر بھی واپس نہیں آنا چاہتا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بات پیش کی:

إن بنيّ يريدون أن يحبسوني عن هذا الوجه ، والخروج معك فيه . فوالله إني لأرجو أن أطأ بعرجتي هذه في الجنة.

(السیرۃ لابن ھشام: مقتل عمرو بن الجموح)

''میرے بچے مجھے اس معرکے سے اور آپ کے ساتھ جانے سے روکتے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں تو اُمید کرتا ہوں کہ اپنے اس لنگڑے پاؤں کے ذریعہ جنت میں چلوں''۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أما أنت فقد عذرك الله فلا جهاد عليك.

''اللہ تعالیٰ نے آپ کے عذر کو قبول کر لیا ہے، لہٰذا آپ پر جہاد فرض نہیں''۔

پھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بیٹوں سے فرمایا:

ما عليكم أن لا تمنعوه ، لعل الله أن يرزقه الشهادة.

''آپ انہیں مت روکیں، شاید کہ اللہ تعالیٰ انہیں شہادت عطا فرما دیں۔

بہرحال نبی کریم ﷺ کے ساتھ جہاد میں گئے اور وہیں میدانِ اُحد میں شہید ہو گئے۔ جو مانگا تھا اللہ تعالیٰ نے وہ عطا کر دیا۔ اور جب انہیں واپس لانے کے لیے اُونٹ پر ان کی لاش مبارک ڈالی گئی تو اونٹ اُحد کی طرف چلتا، مگر مدینہ کی جانب رخ نہ کرتا۔ نبی کریمa کی خدمت میں اس بات کو پیش کیا گیا۔ حضراتِ صحابہ کرامj کی بہت خوبصورت عادت تھی کہ جب بھی کچھ معمول سے ہٹ کر دیکھتے فوراً اسے اللہ کے نبی سے دریافت فرماتے۔ اللہ ہمیں بھی اس کا ذوق وشوق عطا فرمائے کہ ہم بھی ایسی عادت اپنائیں۔ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ عمرو گھر سے چلتے وقت کچھ کہہ رہے تھے؟ بیوی نے کہا کہ ہاں! انہوں نے دعا کی تھی کہ میری لاش بھی واپس نہ آئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ان کی دعا قبول ہوگئی ہے، اب انہیں یہیں دفنانا ہوگا۔

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبہ شہادت کے کچھ واقعات بیان ہوئے، اب صحابیات ا کے کچھ واقعات ذکر کرتے ہیں۔

میرے بچے کو ڈھال بنا دیں: (1)

مشہور واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جہاد کا اعلان ہوا تو گھروں میں تیاریاں شروع ہوگئیں۔ مرد حضرات، بچے، بڑے سب ذوق وشوق سے تیاریوں میں مشغول تھے۔ ایک گھر میں ایک صحابیہ بیٹھی مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ اُن کے خاوند شہید ہو چکے تھے اور وہ خود گود میں اپنے شیر خوار بچے کو لیے مسلسل روئے جا رہی ہیں کہ مدینے کے ہر گھر سے ایک مرد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اللہ کے راستے میں جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے،

مگر میرے گھر سے اس جہاد میں شریک ہونے کے لیے کوئی مرد نہیں جس کے لیے میں تیاری کروں۔ بالآخر اپنے شیر خوار بچے کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! میرے اس چھوٹے بچے کو جہاد کے لیے قبول کر لیجیے، اسے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اتنے چھوٹے بچے کو میں لے جا کر کیا کروں گا؟ یعنی یہ کیا کام کر پائے گا؟ کہنے لگیں: اے اللہ کے نبی! آپ کے صحابہ کرام میں کوئی تو ہوگا جس کے پاس اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ اگر کسی کے پاس ڈھال نہ ہو تو وہ اسے اپنی ڈھال بنا لے، اس طرح میرا بچہ بھی اس جہاد میں قبول ہو جائے گا اور میرے لیے اَجر ہوگا۔

آج کی مائیں اپنے بچے کو مدرسے بھیجتے ہوئے گھبراتی ہیں کہ نہ جانے کیا سکھا دیں گے۔ آج اگر قاری صاحب بچے کو قرآن پڑھانے آتے ہیں تو اس کو اتنا نہیں دیتے جتنا اسکول کی پڑھائی میں ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ عہدِ نبوی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت ایسی فرما دی تھی کہ ان کے گھر کا ہر ہر فرد ایسا ہی تربیت یافتہ تھا کہ جسے دینِ اسلام پر تن مَن دَھن قربان کرنا آسان ہو گیا تھا۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا جذبۂ ایمانی:

میدانِ بدر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی طرف سے شریک ہوئے تھے اور آپ کے بیٹے عبدالرحمٰن جو کہ اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، کفار کی جانب سے اس معرکے میں شریک ہوئے۔ بعد میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ مشرّف بہ اسلام ہو گئے۔ ایک مرتبہ دونوں باپ بیٹا ساتھ بیٹھے ہوئے بات کر رہے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ ابا جان! میدانِ بدر میں ایک مرتبہ آپ میری تلوار کی زد میں آئے تھے مگر

میں نے آپ کو باپ سمجھ کر آپ پر تلوار نہیں چلائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ ربّ العزّت کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اگر تو میری تلوار کی زد میں آجاتا تو تو مجھ سے ہرگز نہ بچ پاتا (کیوں کہ تو کفار کی طرف سے تھا)۔

(مجالسہ و جواھر العلم للدینوری: رقم 1113)

ناممکن بات:

ذرا سوچیے کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحبت میں تربیت پانے والوں کا مزاج ایسا ہوسکتا ہے کہ جب اُن میں سے کسی پر کوئی تکلیف آئے تو وہ خود پر مٹی ڈالے، روئے، سینہ پیٹے اور بین کرے، شور مچائے، بال بکھیرے، نوحہ کرے؟ ہرگز نہیں، کیوں کہ وہ شہادت کے شوقین تھے۔ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق رکھنے والے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں دنیا میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی۔ جب عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ مزاج اور جذبہ تھا تو اہلِ بیت یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گھر والوں کا تو کیا ہی مقام اور تربیت ہوگی۔ معاذ اللہ! ان سے یہ بات جوڑنا کہ بین کیا کرتے تھے، پیٹتے تھے، سروں پر مٹی ڈالتے تھے۔ یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔ وہ حضرات ہرگز کسی ایسے غیر شرعی فعل کا ارتکاب نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو اہلِ بیت تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اپنے گھر کے لوگ تھے۔ واقعہ کربلا بے شک ایک عظیم واقعہ ہے، لیکن بات یہ ہے کہ تاریخِ اسلام ایسے بہت سارے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حق و باطل کا ٹکراؤ صرف کربلا میں نہیں ہوا، ہر دور میں یہ ٹکراؤ ہوا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔

اہلِ کوفہ کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ بلانا:

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ یزید کی بیعت قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اسی دوران کوفہ والوں

نے انہیں دعوت دی کہ آپ آئیں، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ آپ پہلے جائیں اور ہمیں واقعات اور حالات کی خبر دیں، پھر ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ جائیں یا نہ جائیں۔ مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے اور مختار بن ابی عبید کے مہمان بنے۔ اہل کوفہ نے ان کا بے مثال اور بہت شاندار استقبال کیا، اور انہیں اپنی وفاداری کا مکمل یقین دلایا۔ مسلم بن عقیل نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ آپ تشریف لے آئیں، یہاں کے لوگ آپ کے منتظر ہیں۔

اہلِ کوفہ کے حالات جب یزید کے سامنے آئے کہ یہ حضرت حسین کو بلا کر اُن سے بیعت کرنا چاہتے ہیں، تو اس نے غصہ کا اظہار کیا اور کوفہ کے گورنر کو بدل کر عبیداللہ بن زیاد کو نیا گورنر مقرر کر دیا۔ ابنِ زیاد نے آتے ہی زوردار تقریر کی اور کوفہ والوں کو خوب ڈرایا، دھمکایا۔ جب حضرت مسلم کو معلوم ہوا کہ بات بگڑ گئی ہے تو وہ حکمتاً و مصلحتاً ھانی بن عروہ کے گھر میں چھپ گئے جو کہ کوفہ کے سرداروں میں سے ایک سردار تھے۔ یہاں تاریخ میں اختلاف ہے اور اللہ تعالیٰ ہی حقیقتِ حال کو زیادہ جانتے ہیں۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ بارہ ہزار کے قریب کوفی لوگ حضرت مسلم کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے اور اپنی مکمل وفاداری کا یقین دلایا۔ اور بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ کوفہ کے لوگ ڈر گئے اور جو بات انہوں نے حضرت مسلم سے کہی تھی اس سے پیچھے ہٹ گئے، تو حضرت مسلم نے چاہا کہ حضرت حسین کو خبردار کر دیا جائے کہ اب وہ کوفہ نہ آئیں، کیوں کہ حالات بدل چکے ہیں۔ چناں چہ انہوں نے حضرت حسین کو کوفہ آنے سے روکنے کے لیے خط لکھا، مگر بدقسمتی سے یہ دوسرا خط حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو نہیں ملا۔ اور ابنِ زیاد نے بڑی چالاکی سے مسلم بن عقیل کو گرفتار کر کے شہید کر دیا۔ بہرحال سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو جب پہلا خط ملا تو

انہوں نے اپنے اہلِ بیت اور خاص لوگوں کے ساتھ کوفہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو روکنا:

اس وقت چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ جانے سے منع کیا، مگر تقدیر کے فیصلے تو لکھے جا چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کا بلند مرتبہ عطا کرنا تھا۔ محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حنفیہ نامی خاتون سے شادی کی تھی جس سے محمد بن علی پیدا ہوئے اور ان کی شہرت اپنی والدہ کے نام کے ساتھ ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سوتیلے بھائی ہیں۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ بھائی کوفہ جا رہے ہیں تو انہوں) نے کہا: بھیا! مجھے آپ سے بہت محبت ہے، اور سب سے زیادہ مجھے آپ عزیز ہیں۔ آپ اگرچہ یزید کی بیعت قبول نہ کریں، مگر کسی دوسری جگہ نہ جائیں۔ لوگ آپ کے پاس خود آئیں یہ بہتر ہے کہ آپ لوگوں کے پاس جائیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھائی کی اس بات کو سن کر فرمایا: اے میرے چھوٹے بھائی! تم نے بہت اچھی اور شفقت سے پُرنصیحت کی اور شاید کہ تمہاری بات ٹھیک ہو، مگر میں جانے کی تیاری کر چکا ہوں۔

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تم یہی سمجھنا فنا میرے لیے ہے
ہر غیب میں سامانِ وفا میرے لیے ہے
اللہ کے راستے میں جو موت آئے مسیحا
اکسیر یہی اک دوا میرے لیے ہے
کیا غم ہے کہ ہو ساری خدائی بھی مخالف

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چچیرے ہیں تو اس لحاظ سے یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے چچا ہوئے۔ انہیں جب اطلاع ملی کہ حضرت حسین عراق جا رہے ہیں تو یہ خود آئے اور فرمایا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم عراق جا رہے ہو۔ حضرت حسین نے ان کی بات کی تائید کی کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ حضرت ابن عباس i نے فرمایا: اگر تمہارا دشمن اُن لوگوں کے امیر کو قتل کر دے جو تمہیں بلا رہے ہیں، اُن کے دشمنوں کو در بدر کر دے، اُن کے شہروں پر قبضہ جما لے، اس وقت اُنہیں تمہاری ضرورت ہوگی کہ تم جاؤ۔ لیکن اگر اُن کا امیر زندہ ہے، اُن کے درمیان موجود ہے، محصولات ٹیکس وغیرہ وصول کرتا ہے اور لوگ اسے دے رہے ہیں، پھر وہاں کے لوگ تمہیں بلاتے ہیں تو وہ سراسر فتنے اور لڑائی کے لیے بلاتے ہیں۔ میں آپ کا جانا مناسب نہیں سمجھتا، جو بلا رہے ہیں وہی آپ کے سخت دشمن بن جائیں گے لہٰذا آپ مت جائیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ فرمایا: آپ بڑے شفقت سے نصیحت کرنے والے ہیں، مگر میں جانے کا پکا عزم کر چکا ہوں۔

الغرض اور بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے نہ جانے کی درخواست کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس کے لیے شہادت متعین کر دی تھی اسے بھلا کون روک سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (سورۃ یوسف: الآیۃ 21)

ترجمہ: ''اور اللہ کو اپنے کام پر پورا قابو حاصل ہے، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے''۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کربلا آمد:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو راستے میں مسلم بن عقیل کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ نے واپسی کا ارادہ کرلیا۔لیکن حضرت مسلم کے بھائیوں نے کہا کہ ہم بدلہ لیں گے یا شہید ہو جائیں گے۔اس پر حضرت حسین نے فرمایا: تمہارے بغیر زندگی کا کوئی لطف نہیں ہے۔ اب سب کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔جب آپ کو ابنِ زیاد کی فوج کا ہراوّل دستہ نظر آیا تو آپ نے کربلا کا رخ کرلیا۔ابنِ زیاد کی چاہت یہ تھی کہ آپ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلیں، اس کی خلافت قبول کرلیں۔خلافت کا معاملہ بہت اہم ہے۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے انکار کردیا اور تین معقول باتیں ارشاد فرمائیں کہ اس میں سے کوئی بھی منتخب کرلو:

1. براہِ راست یزید سے بات کرنے دو۔
2. جہاں سے آئے ہیں، ہم واپس لوٹ جاتے ہیں۔
3. کسی اسلامی سرحد پر جانے دو۔

ابنِ زیاد نے کوئی بھی بات نہ مانی اور انہیں بیعتِ یزید پر مجبور ہونے کے لیے کربلا میں نہتا چھوڑ دیا۔مگر یہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ تھے، اہلِ بیت میں سے تھے، استقامت اور صبر کا پہاڑ تھے۔حق کے خلاف ڈٹ تو سکتے تھے لیکن جھک نہیں سکتے تھے۔وہ ہرگز اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ ابنِ زیاد ان چند لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔آخر ابنِ زیاد نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تمام ساتھیوں کو شہید کردیا۔حضرت حسین کی گود میں ایک بچہ تھا، ایک تیر دشمن کی صف سے آیا جو سیدھا اس بچے کو لگا۔آپ اس کا خون صاف کرتے ہوئے فرما رہے تھے: اے اللہ! ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما جنہوں نے پہلے ہمیں بلایا، اب ہمیں قتل کررہے ہیں۔اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تلوار

خود ہاتھ میں لی اور مردانہ وار مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ (الاصابہ:2/17)

کٹا کر گردنیں دِکھلا گئے ہیں یہ کربلا والے
کسی بندے کے آگے جھک نہیں سکتے خدا والے

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے باطل کے خلاف ایک مثال قائم کر دی کہ جیسے میرے بڑوں نے قربانیاں دیں ویسے ہی ہم بھی حاضر ہیں اور اسی خاندان کا حصہ ہیں۔

اہلِ بیت کی مستورات کا صبر:

اہلِ بیت کی مستورات بھی چوں کہ اس سفر میں ساتھ تھیں، انہیں جب معلوم ہوا کہ خاندانِ نبوت کے افراد شہید ہو گئے ہیں، تو انہوں نے جس صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا آج دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ اہلِ بیت کی مستورات ہیں، یہ کپڑے پھاڑنے والی اور واویلا کرنے والی نہیں تھیں۔ ان کے سامنے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی مثال تھی۔

سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ:

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے محبوب چچا سیدنا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سید الشہداء یعنی شہیدوں کے سردار ہیں۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر ہندہ (حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کی والدہ جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئی تھیں، بعد میں اسلام قبول کیا) نے قسم کھائی اور اپنے غلام وحشی کو بھیجا کہ حضرت حمزہ کو شہید کرواور ان کا دل اور جگر نکال کر لاؤ۔ اور لالچ یہ دیا کہ تم آزاد ہو جاؤ گے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جوانمردی اور بہادری کے آگے ہر کوئی سامنے آنے سے گھبراتا تھا۔ چناں چہ حضرت وحشی (یہ بھی اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، بعد میں اسلام قبول کیا) چھپ کر بیٹھ گئے کہ پیچھے سے اچانک وار کروں گا۔ جب حضرت

حمزہ رضی اللہ عنہ کا گزر اسی راستے سے ہوا جہاں یہ چھپ کر بیٹھے تھے تو وحشی نے پیچھے سے وار کیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ دشمن نے ان کی آنکھوں کو نکال دیا، ناک و کان کو کاٹ دیا، سینہ چاک کر کے دل اور جگر کو نکال دیا۔ ہندہ نے کلیجہ چبانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی تو پھینک دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بے رحمانہ طریقے سے شہید کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہداء کے جسموں کو دیکھا تو اُن میں اپنے محبوب چچا کا یہ حال دیکھا کہ ہاتھ، ناک، کان، زبان، اور پاؤں سب کاٹ دیے گئے ہیں۔ سینہ بھی چاک کیا ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی ماتم نہیں کیا، کوئی حکم نہیں دیا کہ اپنے سینوں کو تم بھی چاک کرو، اپنے سینوں کو پیٹو، زور زور سے آوازیں لگاؤ۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

اتنے میں اطلاع ملی کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سگی پھوپھی تھیں، وہ آ رہی ہیں اور اپنے بھائی کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے منع کیا کہ آپ انہیں دیکھ کر برداشت نہیں کر پائیں گی، ان کی حالت ایسی نہیں ہے۔ مگر وہ آگے بڑھتی رہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اپنی والدہ کو روکو۔ حضرت زبیر نے آگے بڑھ کر والدہ کو روکنے کی کوشش کی مگر حضرت صفیہ نے پوری قوت سے اپنے بیٹے کو ہٹا دیا۔ حضرت زبیر نے فرمایا: اماں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہیں قدم رک گئے اور فرمایا: مجھے اپنے بھائی کی شہادت کی اطلاع ملی ہے، میں اس کے لیے کفن کا کپڑا لائی ہوں، اسے لے لو۔ اللہ اکبر!

کربلا کے میدان میں اہلِ بیت کی مستورات نے جس صبر وحوصلے کا مظاہرہ کیا، وہ جانتی تھیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ کل کسی اور نے صبر کیا تھا، آج انہیں صبر کرنا ہے۔ اگر یہ قربانی قبول ہو جائے تو اللہ کے ہاں سعادتیں ہی سعادتیں ہیں۔ بہرحال یہ ہے وہ مزاجِ صحابہ رضی اللہ عنہم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت سے بنا تھا۔ نہ کوئی شور وغوغا ہے، نہ کوئی جلوس ہے، اور نہ خلافِ شرع کی کوئی بات۔ یہاں تک کہ اتنا کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے تو اپنے چلتے قدموں کو روک لیا، ایک انچ آگے نہیں بڑھنے دیا۔ کیا ہی خوب اہمیت تھی ان حضرات کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمائے۔

میدانِ جنگ میں نماز کی اہمیت:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب دشمنوں کے ساتھ لڑ رہے تھے، اسی دوران نماز کا وقت ہوگیا۔ کاش! یہ بات ہماری سمجھ میں آجائے۔ آج کا اَلمیہ یہ ہے کہ نماز کے لیے جانے میں جان جاتی ہے۔ فجر کی نماز کے لیے اٹھنا تو کتنا مشکل ہوگیا ہے۔ اور وہاں اولاد شہید ہو رہی ہے، ساتھی شہید ہو رہے ہیں، چاروں طرف دشمن موجود ہیں، پانی میسر نہیں ہے اور نماز کا وقت آگیا۔ اس وقت موقع تھا کہ وہ نماز قضا کر سکتے تھے، لیکن اللہ کا حکم پورا کرنا تھا۔ عین اس حالت میں بھی انہوں نے نماز ادا کرنے کے لیے مہلت مانگی۔ رہتی دنیا کے لیے سبق دے دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُمتی نماز نہیں چھوڑتا۔ واقعہ کربلا سبق دے رہا ہے کہ ہمیں اپنی نمازوں کی فکر کرنی ہے۔ اُن ظالموں نے ایک نماز پڑھنے کی مہلت بھی نہیں دی اور ہر طرف سے وار کرکے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت:

ان کے سامنے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق h کی شہادت کا واقعہ تھا۔ جب وہ عین مصلے پر کھڑے فجر کی نماز پڑھا رہے ہیں، اتنے میں ایک مجوسی غلام ابولؤلؤ فیروز نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر تین وار کیے جس سے آپ زخمی ہوئے اور نیچے بیٹھ گئے۔ آپ نے نماز مکمل کرنے کے لیے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو آگے کر دیا جنہوں نے نماز مکمل کی۔ نماز کے بعد آپ کو اپنے حجرے میں لے جایا گیا۔ زخم کی شدت ایسی تھی کہ بار بار بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ جب ذرا ہوش آتا تو اِردگرد موجود لوگوں سے پوچھتے کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ وہ کہتے کہ جی ہاں۔ فرماتے کہ اسلام میں کوئی حصہ نہیں اس شخص کا جو نماز نہ پڑھے۔

غور کیجیے کہ اچانک حملہ ہو گیا اور نماز پھر بھی جاری رہی۔ یہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج تھا کہ کسی حالت میں بھی نماز نہ چھوڑتے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی اسی نماز کی درخواست کی۔ نماز کا سجدہ وہ سجدہ ہے جس پر آسمان کے فرشتے رشک کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ فرشتوں سے آگے مقام عطا کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تیروں اور تلواروں کی جھنکار میں بھی اس سجدے سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے نماز سے کبھی بھی غفلت نہیں کرنی چاہیے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے والد کی مثال موجود تھی۔ جس وقت امیر المؤمنین، خلیفہ رابع حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دشمن نے وار کیا، وہ فجر کی نماز کا وقت تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو نماز کی متوجہ کر رہے تھے: الصلوٰۃ الصلوٰۃ۔ اسی دوران تین آدمیوں

(عبدالرحمٰن جو کہ ابنِ ملجم سے مشہور ہے، اور یہی مرکزی آدمی تھا۔ وردان اور شَبِیب بن بَجَرہ اشجعی) نے مل کر حملہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جسم مبارک سے خون جاری ہو گیا۔ دو حملہ آور بھاگ گئے اور ابن ملجم پکڑا گیا۔ آپ کو گھر لے جایا گیا اور آپ نے جعدہ بن ہُبیرہ کو فجر کی نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ دامادِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وقت کا امیر المؤمنین لوگوں کو نماز کی طرف متوجہ کر رہا ہے اور جب شدت کا حملہ ہوتا ہے اور اتنی طاقت نہیں رہتی کہ خود نماز پڑھا سکیں تو دوسرے کو امامت کے لیے آگے بڑھاتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی نماز فوت نہ ہو جائے۔ یہ مزاج انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملا تھا۔ ان عظیم قربانیوں سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق گزارنی ہے، اور درمیان میں جو قربانی آئے وہ دے دینی ہے، مگر اللہ کے حکم کو نہ توڑنا ہے اور نہ چھوڑنا ہے۔

(البدایۃ والنہایۃ: 11/5-16)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

میدانِ کربلا میں اہلِ بیعت پیاس کی حالت میں تھے، ان کا پانی بند کر دیا گیا تھا، مگر ان حضرت نے اللہ کی رضا کے لیے صبر کیا۔ اِن حضرات کے سامنے امیر المؤمنین خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مثال تھی۔ دشمن نے 40 دن تک ان کا پانی بند کیا، کسی طرح سے بھی پانی ان تک نہ پہنچنے دیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اپنے محاصرے کے وقت محاصرے کرنے والوں کے سامنے آئے اور فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو میٹھے پانی کی ضرورت تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ کون ہے جو بئرِ رُومہ کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دے، اور اس کا بہترین بدلہ اسے جنت میں ملے گا؟ تو میں نے اپنے مال سے وہ کنواں خرید کر وقف کر

دیا تھا۔کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے؟ محاصرین نے کہا کہ ہمیں معلوم ہے۔فرمایا: پھر بھی آج تم نے مجھ سے پانی روکا ہوا ہے۔ (سنن ترمذی: باب فی مناقب عثمان رضی اللہ عنہ)

اُمّ المؤمنین امی جان حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کو جب پتا چلا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پانی بند کیا ہوا ہے تو وہ بہت احتیاط کے ساتھ چھپا کر پانی لائیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہنچنے کی کوشش کی، مگر محاصرین نے انہیں نہ جانے دیا اور ان کی سواری کی تلاش لے کر پانی برآمد کرلیا، پھر اسے بہادیا۔ (تاریخ کبیر للبخاری: 7/237،طبقات ابن سعد: 2/128)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر اُن بدبختوں سے فرمایا: اے لوگو! تم ایسی مثال قائم کر رہے ہو جو نہ مسلمانوں میں ہے اور نہ کافروں میں۔تم نے اس شخص (یعنی امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا کھانا پینا بند کردیا حالاں کہ اس طرح تو یہ روم وفارس والے اپنے قیدیوں کے ساتھ بھی نہیں کرتے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: 15/209)

بہرحال باغیوں کی یہ جماعت ننگی تلواروں کے ساتھ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے ارادے سے گھر میں داخل ہوگئی۔اس وقت حضرت عثمان غنی کے پاس ان کی زوجہ نائلہ بنت فرافصہ بیٹھی ہوئی تھیں اور حضرت عثمان قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔آپ کی اہلیہ نے ان باغیوں کے ناپاک ارادے دیکھے تو سامنے آگئیں، مگر اُن ظالموں نے اس نیک خاتون کے ہاتھ پر تلوار کا وار کیا جس سے ان کا ہاتھ زخمی ہوگیا۔حضرت عثمان اپنی زوجہ کو پیچھے ہٹانے لگے۔قرآن پاک کھلا ہوا تھا اور اُن ظالموں نے اسی وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر وار کر کے انہیں شہید کر دیا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے چھینٹے قرآن پاک کی اس آیتِ شریفہ پر پڑے:

﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾ (سورۃ البقرۃ: الآیۃ 137)

ترجمہ: ''اب اللہ تمہاری حمایت میں عنقریب ان سے نمٹ لے گا''۔

اللہ اکبر! یہ کیسے عظیم لوگ تھے۔ کسی کی شہادت کی گواہی اللہ کا قرآن دے رہا ہے، تو کسی کی شہادت کی گواہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دے رہے ہیں، اور کسی کی شہادت کی گواہی منبرِ رسول اور مصلی رسول دے رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے کامل استاذ تھے۔ ایک ایک کی ایسی تربیت کردی تھی کہ ہر ایک نے اس دین کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا:

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

جہاں لوگوں کے لیے صبر کرنا مشکل ہوتا ہے، حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہاں شکر کیا کرتے تھے۔ خوش دلی اور رغبت کے ساتھ اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

شہیدانِ وطن کے حوصلے تھے دید کے قابل
وہاں پر شکر کرتے تھے جہاں پر صبر مشکل تھا

حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ:

اہلِ روم سے لڑائی میں صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ گرفتار ہو گئے۔ رومی فوجی انہیں گرفتار کر کے اپنے بادشاہ کے دربار میں لے گئے۔ بادشاہ عیسائی مذہب پر تھا اور چاہتا تھا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ عیسائی بن جائیں العیاذ باللہ۔ بادشاہ کو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی صلاحیتوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا گیا تھا، اسی وجہ سے بادشاہ انہیں نصرانی بنانے کی بات پر گویا کہ اَڑ گیا۔ بادشاہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ نصرانیت کو قبول کرلیں، آپ میرے مقرّب بن جاؤ گے اور میں اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کردوں گا۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا: اگر میں ایسا نہ کروں تو پھر تم کیا کرو گے؟

بادشاہ نے کہا کہ پھر تم دیکھو کہ میں کیا کروں گا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ان کو ایک ستون سے باندھ کر ایک ماہر تیر انداز سے کہا کہ ان کے دائیں بائیں کا نشانہ لو تاکہ یہ ڈر جائیں۔ چناں چہ انہیں ڈرایا گیا، مگر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ایمان پر ثابت قدم رہے۔

جب بادشاہ نے مختلف انداز سے سب کچھ کر کے دیکھ لیا اور یہ کسی طرح نہ مانے تو بالآخر بادشاہ کو غصہ آ گیا اور اس نے حکم دیا کہ ایک کڑاہی لاؤ جس میں کھولتا ہوا پانی ہو۔ چناں چہ اس کھولتے ہوئے پانی میں ایک مسلمان قیدی کو ڈال دیا گیا، اس کی چیخ نکلی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ مسلمان شہید ہو گئے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر تم میری بات مان لو تو بچ سکتے ہو۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں نہ مانوں تو کیا کرو گے؟ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو پکڑ کر اس کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دو۔ سپاہیوں نے پکڑ کر کھولتے ہوئے پانی کے جو قریب کیا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سپاہیوں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ وہ رو رہے ہیں۔ بادشاہ بڑا خوش ہوا کہ ڈر کی وجہ سے اب اس کی بات چل جائے گی۔ اس نے حضرت عبداللہ کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ سپاہی انہیں لے آئے تو بادشاہ نے کہا کہ تم پہلے ہی میری بات مان لیتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے بادشاہ! تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں موت کے خوف سے رو رہا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں موت کے خوف سے نہیں رو رہا، میں تو یہ سوچ کر رو رہا ہوں کہ میری صرف ایک جان ہے جسے میں اللہ کے راستے میں قربان کرنے لگا ہوں۔ کاش! میری ایک ہزار جانیں ہوتیں اور میں یکے بعد دیگرے اسے اللہ پاک کے لیے قربان کرتا رہتا۔ میری چاہت تو یہ ہے۔

بادشاہ کو ان کی بات پسند آئی اور کہا کہ اگر تم میرے سر کا بوسہ لو تو میں تمہیں چھوڑ دوں

گا۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا: میں ایسا نہیں کروں گا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے (۸۰) قیدیوں کو بھی چھوڑ دوں گا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ صرف بادشاہ کے سر کا بوسہ لینے سے مسلمان قیدی آزاد ہو سکتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ چناں چہ انہوں نے آگے بڑھ کر بادشاہ کے سر کو بوسہ دیا اور بادشاہ نے بدلے میں مسلمان قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی جماعت کو لے کر مدینہ طیبہ پہنچے اور امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کارگزاری سنائی۔ حضرت عمر نے فرمایا: ہر مسلمان پر لازم ہے کہ عبداللہ کے سر کا بوسہ لے۔ اور خود آگے بڑھ کر ان کے سر کا بوسہ لیا۔

(شعب الایمان: 179 / 3، تاریخ دمشق: 158 / 27)

حضرت اُمّ سُلَیم رضی اللہ عنہا کا عمل:

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح صحابیات ا نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے بہت فیض حاصل کیا۔ آج کچھ نادان ان عظیم اور باحیا مستورات کے بارے میں ایسی ویسی باتیں کرتے ہیں کہ صحابیات نے کربلا کے میدان میں واویلا کیا، نوحہ کیا وغیرہ العیاذ باللہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کو معلوم ہی نہیں کہ مزاجِ صحابہ وصحابیات کیا ہے۔ حضرت اُمّ سُلَیم رضی اللہ عنہا کا ایمان افروز ایک واقعہ بات سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا سے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے تھے، وہ بیمار تھے۔ اس کا انتقال ہوگیا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے، کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر تھے۔ حضرت اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا نے گھر والوں سے کہا کہ کوئی بھی ابوطلحہ کو نہیں بتائے گا، میں خود انہیں اس کی اطلاع دوں گی۔ حضرت ابوطلحہ کو اس بچے سے بڑی محبت تھی۔ چناں چہ رات کے وقت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ واپس

تشریف لائے تو بچے کا پوچھا۔ اُمّ سلیم نے کہا کہ اب تو پہلے سے بہتر ہوگیا ہے۔ پھر اُمّ سلیم نے انہیں ایک اچھی اور نیک بیوی کی طرح رات کا کھانا پیش کیا، رات گزاری جس طرح کہ میاں بیوی گزارتے ہیں۔ فجر کے قریب جب دیکھا کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مطمئن ہیں تو عرض کیا کہ ایک مسئلہ آپ سے پوچھنا ہے۔ خاوند نے کہا کہ پوچھو۔ عرض کیا کہ اگر کوئی کسی کو اپنا سامان بطورِ امانت کے دے اور پھر کچھ عرصے بعد واپسی کا مطالبہ کرے تو جس کو امانت دی تھی، اسے وہ سامان روکنے کا حق ہے؟ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، جس کے پاس امانت رکھوائی گئی ہے اسے روکنے کا حق نہیں ہے۔ عرض کیا کہ پھر آپ اپنے بیٹے کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ سے ثواب کی اُمید رکھیں۔ آپ کے آرام اور راحت کی خاطر میں نے ہر چیز کو برداشت کیا۔ اب آپ اپنے بچے کی تجہیز و تدفین کا انتظام کیجیے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوری بات سنائی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم دونوں کو تمہاری اس رات میں برکت عطا فرمائے چناں چہ حضرت اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا حاملہ ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے نرینہ اولاد عطا فرمائی جس کا نام عبداللہ رکھا۔ (صحیح بخاری: 172 / 1، صحیح مسلم: 1409 / 4)

بخاری شریف میں ہی دوسری حدیث ہے کہ بعد میں اِن حضرت عبداللہ کے نو بیٹے ہوئے اور سب نے قرآن پاک پڑھا یعنی سب کے سب عالم بنے۔

شہادت کے فضائل:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہادت کے جو فضائل حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتائے تھے وہ ان کے اندر اُتر گئے تھے۔ ان میں سے چند فضائل ابھی ذکر کیے جا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کے اندر جذبہ شہادت بیدار ہوجائے تو کم سے کم نماز کے لیے ہی

ہر دفعہ وقت پر تیار ہو جائے۔ شوقِ شہادت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں رَچ بس گیا تھا۔ تڑپتے تھے کہ کسی جگہ پر شہادت مل جائے۔ اور موت کے وقت کہا کرتے تھے کہ ربِّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ (صحیح بخاری: رقم 2801۔ قصہ ستّر قرّاء صحابہ کی شہادت)

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب شہید کے جسم کا پہلا خون کا قطرہ زمین پر گرتا ہے تو اسی وقت اس شہید کی مغفرت ہو جاتی ہے، اور وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیتا ہے، اور اسے ایمان کا زیور پہنایا جاتا ہے، عذابِ قبر سے بچ جاتا ہے، بڑی گھبراہٹ سے اطمینان بخشا جاتا ہے، اس کے سر پر وقار کا تاج سجایا جاتا ہے جس کا ایک یاقوت دنیا اور دنیا میں جو کچھ بھی ہے اس سے بہتر ہے، بہتّر (72) حورِعین سے اس کی شادی کرائی جاتی ہے، اور اس شہید کو اپنے ستّر رشتہ داروں کے لیے حقِ شفاعت دیا جاتا ہے۔ (سننِ ترمذی: رقم 1663، زاد المعاد: فصل فی فضل الشہید)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت میں جانے کے بعد کوئی جنتی دنیا میں واپس لوٹنے کو پسند نہیں کرے گا اگرچہ اسے دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے دے دیا جائے سوائے شہید کے۔ (شہید) یہ تمنا کرے گا کہ اسے دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے اور وہ دس بار قتل کیا جائے۔ یہ سب اس وجہ سے کہ شہید جنت میں اپنی فضیلت کو دیکھے گا (تو اسے بار بار شہادت حاصل کرنے کا شوق ہوگا)۔

(صحیح بخاری: رقم 2662)

بھلا جنت کے مزے کو چھوڑ کر کوئی پریشانی کی طرف آتا ہے؟ صرف شہید کہے گا کہ مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیں تاکہ میں پھر اللہ کے راستے میں قتل کیا جاؤں۔

جب کوئی آدمی عام حالت میں فوت ہوتا ہے تو اسے غسل دیا جاتا ہے اور کفن پہنایا

جاتا ہے، لیکن جب کوئی اللہ پاک کے راستے میں شہید ہو جائے تو حکم دیا جاتا ہے کہ یہ میری محبت میں اپنے خون میں نہلا چکا ہے۔ لہٰذا اب اسے کسی غسل کی ضرورت نہیں، اس کو اسی لباس میں دفنا دو۔ یہ میرے پاس اسی طرح آئے گا اور اس کا خون گواہی دے رہا ہوگا۔ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اللہ پاک کے راستے میں جسے زخم لگتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں جو زخم اس لگا ہے، مگر یہ کہ قیامت کے دن وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا اور اس زخم سے خون بہہ رہا ہوگا، رنگ تو خون ہی کا ہوگا اور اس کی خوشبو مشک کی ہوگی۔

(موطا امام مالک: باب الشھداء فی سبیل اللہ)

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا بسترِ مرگ پر کلام:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آخری وقت میں اپنے بستر پر فرمایا: میں تقریباً سو جنگوں میں شریک ہوا۔ اور میرے جسم پر کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں تلوار، نیزے یا تیر کا زخم نہ ہو، مگر میں آج اپنے بستر پر اُونٹ کی طرح مر رہا ہوں (جس طرح اونٹ یا تو نحر کیا جاتا ہے تو حلال ہوتا ہے، یا پھر اپنی طبعی موت مرتا ہے، میں بھی اُونٹ کی طرح اپنی طبعی موت مر رہا ہوں باوجودیکہ اتنی جنگوں میں شریک ہوا مگر شہادت نہیں ملی) بزدلوں کی آنکھیں اب نہ سوئیں یعنی بزدل آدمی کی آنکھیں اس بات سے کھل جانی چاہییں۔

(اسد الغابہ: 3/143، باب الخاء)

اللہ کی شان کہ ان کا اسی بستر پر انتقال ہو گیا۔ کسی اللہ والے نے بڑی خوبصورت بات آپ کے بارے میں فرمائی کہ ان کا لقب سیف اللہ تھا یعنی اللہ کی تلوار۔ اور اللہ کی تلوار کسی کافر سے نہیں ٹوٹ سکتی تھی۔ یہ شہادت نہ ملنے کا راز تھا۔ اسی پر ہم غور کریں کہ

جب ایک صحابی کا شہادت کے لیے دل اتنا تڑپتا تھا تو اہل بیعت کا معاملہ کیا ہوگا۔

خاص درود شریف:

اہل بیعت سے محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ایک درود شریف ہے جو اہل بیعت سے محبت میں اضافے کے لیے پڑھا جاتا ہے۔حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کی شرح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: جسے یہ بات خوش کرتی ہے کہ قیامت کے دن اس کا اعمال نامہ پورا پورا بہت بڑے ترازو میں تُلے، اسے چاہیے کہ ہم پر اس طرح سے درود پڑھے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ ﷺ النَّبِيِّ وَأَزْوَاجِهٖ أُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَذُرِّيَّتِهٖ وَأَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ.

(فتح الباری شرح البخاری: باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

خلاصہ کلام:

اب ساری تفصیل میں خلاصتاً دو نکتے عرض کرنے ہیں:

1. حسینیت کیا ہے؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ایک چیز کو شریعت کے خلاف سمجھا تو باطل کے سامنے ڈٹ گئے مگر جھکے نہیں۔ اللہ کے لیے اپنی جان دے دی۔ گھر والوں کو بھی قربان کر دیا۔ یہ ہے حسینیت۔ اور یہ ہے کربلا کا پیغام کہ اگر حق کے خلاف کوئی بات ہے تو گردن کٹ تو سکتی ہے لیکن جھک نہیں سکتی۔

2. دوسرا اہم نکتہ انتہائی حساس اور انتہائی اہم ہے۔اسے سمجھنے کے لیے کچھ توجہ کی ضرورت ہے۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔آپ کے بڑے بھائی حضرت

حسن رضی اللہ عنہ اور والد ماجد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے، پھر ان کے انتقال کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے، پھر ان کی شہادت کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے خلافت کی بیعت کی۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان حضراتِ کرام کو اہل حق سمجھتے ہوئے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور بیعت کی۔ اسی طرح تاریخ کے اَوراق پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت قبول کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انہیں حق پر سمجھتے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کیا کیا؟

پہلے اہلِ حق لوگ آرہے تھے تو اہل بیعت کے لوگ ان سے بیعت کرتے تھے۔ اب سامنے یزید آیا تو ان کی نظر میں یہ اہل حق میں سے نہیں تھا۔ خلافت کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرح اس زمانے میں اور بھی کئی صحابہ نے یزید کی بیعت قبول نہیں کی تھی۔ بہرحال حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اب پہلے جیسا سلسلہ نہیں ہے، اور پہلے والی بات نہیں ہے تو ان کی شان کے خلاف یہ تھا کہ ایک چیز کو باطل سمجھتے ہوئے اسی کو قبول کرلیں۔

کربلا میں یہ بات سمجھا گئے کہ خلافتِ راشدہ حق تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت حق تھی۔ آج حسینیت حق پر ہے۔ اہل بیعت کے لوگ ان ساری باتوں کا خوب اِدراک رکھتے تھے۔ بڑی تکلیفیں برداشت کیں مگر حق پر ثابت قدم رہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیں دین پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

سورة کہف کے فوائد
سورة حجرات کے ساٹھ فوائد
علم حدیث
سنت حبیب
تفسیر مکی
جلد اول
اسیر ہما
مثالی عورت
مثالی مرد
نصیحت وصیت
بیانات سیرت

محرّم الحرام کی اہمیت

محرّم کے مہینے میں عام طور سے ایک یہ تصوّر ہے کہ محرّم کا تعلق فقط حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور کربلا کے واقعہ سے ہی ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ ان کا واقعہ یقیناً محرّم میں ہوا۔ 10 محرّم میں ہوا۔ بہت بڑی قربانی تھی، وہ سب اپنی جگہ بہت بڑی باتیں ہیں۔ لیکن محرّم سے مراد صرف اسی ایک واقعہ کو لے لینا اور باقی ساری باتوں کو بھول جانا یہ لاعلمی کی بات ہے۔ اس بندے کو دین کا پتا ہی نہیں ہے۔

لغت کے حساب سے محرّم کا مطلب ہے مُعَظّم، محترم، معزّز۔ یہ مہینہ اِعزاز والا ہے، احترام والا مہینہ ہے اسی لیے اس کا نام محرّم ہے۔ ایک حدیث شریف بیان ہوئی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے موقع پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا: اس وقت زمانے کی رفتار وہی ہے جس دن اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ یعنی اب اس کے دنوں اور مہینوں میں کوئی کمی زیادتی نہیں ہے جو جاہلیت کے زمانے میں مشرکین کر دیا کرتے تھے۔ اب وہ ٹھیک ہو کر اس طرز پر آ گئی ہے جس پر ابتدا میں اصل میں تھی۔

الکہف ایجوکیشنل ٹرسٹ
AL-KAHAF EDUCATIONAL TRUST